۱۶ مئی ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ـ شمارہ نمبر: ۱۰

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمودالحق صدیقی، نوید نون ـ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ـ ۳۵، بلاک ـ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ـ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ـ۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱ـ۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ـ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔

۲ ـ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ـ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ـ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ـ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

# ایران جنگ اور سعودی پالیسی کی تشکیلِ نو

**Dr Neil Quilliam**

آبنائے ہرمز کی بندش نے سعودی عرب کی ''ویژن ۲۰۳۰ء'' کی حکمتِ عملی اور اس کے معاشی انقلاب کے منصوبوں کو خطرات سے دوچار کردیا ہے۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے ایران کے خلاف جاری جنگ نے سعودی عرب کے لیے کئی پیچیدہ چیلنجز پیدا کر دیے ہیں، جن میں آبنائے ہرمز کی بندش، متحدہ عرب امارات کے ساتھ بڑھتی ہوئی خلیج، اور امارات کا تیل برآمد کرنے والے اتحاد ''اوپیک'' سے علیحدہ ہونا شامل ہیں۔اس جنگ نے سعودی ولی عہد محمد بن سلمان (ایم بی ایس) کو بھی اپنی پالیسیوں پر ازسرِنو غور کرنے پر مجبور کردیا ہے۔

محمد بن سلمان سے قبل سعودی پالیسی عمومی طور پر سست رفتار، اجتماعی مشاورت پر مبنی اور بڑی حد تک قابلِ پیش گوئی ہوا کرتی تھی۔ولی عہد نے داخلی ماحول میں غیر معمولی سرگرمی پیدا کی اور ایک ایسی جارحانہ اور بعض اوقات غیر متوقع خارجہ پالیسی اختیار کی جس نے سعودی عرب کو متعدد مشکلات سے دوچار کیا۔

تاہم ایران کے خلاف جنگ نے ایک مرتبہ پھر مملکت کے فیصلہ سازی کے عمل کو سست کر دیا ہے، کیونکہ قیادت اب اپنی طویل المدتی حکمتِ عملی کا ازسرِنو جائزہ لے رہی ہے۔سعودی قیادت بخوبی جانتی ہے کہ اس جنگ کا جو بھی نتیجہ نکلے، وہ آئندہ کم از کم دو دہائیوں تک پورے خطے کے مستقبل کا تعین کرے گا۔

یہ حیرت کی بات نہیں کہ سعودی عرب کی نئی حکمتِ عملی کا مرکز اب آبنائے ہرمز بن چکی ہے، جہاں سے اس کی بیشتر تیل کی برآمدات ہوتی ہیں اور دیگر تجارتی سامان گزرتا ہے۔

اگرچہ مملکت مدتوں سے اس اہم گزرگاہ پر اپنے انحصار کے خطرات سے آگاہ تھی، لیکن ماضی میں اس کی طویل بندش کو انتہائی غیر متوقع سمجھا جاتا تھا۔اب اس بندش نے نہ صرف تجارت بلکہ ''ویژن ۲۰۳۰ء'' کی کامیابی پر بھی سوالات پیدا کر دیے ہیں۔

اب جبکہ آبنائے ہرمز ایک مرتبہ بند ہو چکی ہے، تو مستقبل میں اس کے دوبارہ بند ہونے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہے گا۔یہ صورتِ حال سعودی عرب کی تجارتی سرگرمیوں اور معاشی تبدیلی کے منصوبوں کے لیے ایک طویل المدتی خطرہ بن چکی ہے۔بار بار یا طویل تعطل سے حکومتی آمدنی، سرمایہ کاروں کے اعتماد اور مملکت کی ایک محفوظ تجارتی، لاجسٹک اور مالیاتی مرکز کے طور پر ساکھ متاثر ہوسکتی ہے۔''ویژن ۲۰۳۰ء'' اور اس کے بعد آنے والے معاشی منصوبوں کی کامیابی توانائی اور آمدنی کے مستقل بہاؤ اور محفوظ بحری راستوں پر منحصر ہے۔

اسی لیے سعودی عرب اب اپنے ''معاشی جغرافیہ'' کو ازسرِنو ترتیب دینے پر غور کر رہا ہے۔مملکت آبنائے ہرمز پر انحصار کم کرتے ہوئے اپنی پالیسی کا رخ بحیرۂ احمر کی جانب موڑ رہی ہے۔سعودی عرب کے مغربی ساحل پر واقع منصوبے، جن میں بندرگاہیں، صنعتی زونز اور سیاحتی ترقیاتی اسکیمیں شامل ہیں، اب کلیدی ترجیحات بن جائیں گے۔مملکت کی دو ساحلی پٹیاں اسے اپنے ہمسایہ ممالک پر ایک نمایاں جغرافیائی برتری فراہم کرتی ہیں، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خود کو خصوصاً متحدہ عرب امارات کے مقابلے میں خطے کے مرکزی برآمدی اور لاجسٹک مرکز کے طور پر منوانا چاہتی ہے۔

اس کے مغرب کی جانب جھکاؤ کا مطلب یہ ہے کہ قومی تیل کمپنی ''سعودی آرامکو'' کو اپنی خام تیل برآمدات بحیرۂ احمر کی جانب منتقل کرنا ہوں گی، یا کم از کم ایسی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی کہ روزانہ سات ملین بیرل تیل مشرق سے مغرب منتقل کیا جاسکے، تاکہ جنگ سے پہلے کی برآمدی سطح برقرار رہے۔اس وقت تقریباً چالیس لاکھ بیرل یومیہ خام تیل پائپ لائن کے ذریعے مشرق سے مغرب منتقل کر کے بحیرۂ احمر کے ''ینبع'' ٹرمینل سے برآمد کیا جا رہا ہے۔اگرچہ موجودہ برآمدات کم ہیں، تاہم سعودی عرب اپنے بیشتر خلیجی پڑوسیوں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہے، کیونکہ ان کی برآمدات اب بھی خلیج ہی تک محدود ہیں۔تیل کی قیمتیں تقریباً ۱۲۰ ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی ہیں، جو جنگ سے پہلے کی سطح سے تقریباً دوگنی ہیں، اس لیے ریاض کے پاس مالیاتی استحکام کی ایک حد تک صلاحیت موجود ہے۔

اندرونی صفحات پر

- امریکا۔چین تصادم کا خدشہ
- ترکیہ: طرزِ حرب بدلنے والی ٹیکنالوجی کی نمائش
- کیا تیل کا بحران زور پکڑے گا
- پاکستانی جین زی: ذہنی دباؤ کا بڑھتا بحران
- نئے ورک کلچر کی تلاش
- تکنیکی تربیت، خطرے کی گھنٹی
- مصنوعی ذہانت کی لڑائی

تاہم اگر سعودی عرب خود کو ایک علاقائی تجارتی مرکز کے طور پر منوانا چاہتا ہے، تو اسے ایسی بنیادی تنصیبات پر طویل المدتی سرمایہ کاری کرنا ہوگی جو بحیرۂ احمر اور خلیج کے بڑے شہری مراکز کے درمیان سامان، خصوصاً تیل، کی منتقلی کو ممکن بنا سکیں۔ اس عمل میں زیادہ وقت اور زیادہ اخراجات ناگزیر ہوں گے، مگر آبنائے ہرمز کے مسئلے کی ساختی نوعیت نے سعودی عرب کے لیے متبادل راستہ تقریباً ختم کر دیا ہے۔

لیکن آبنائے ہرمز سے ہٹ کر راستے اختیار کرنے سے خطرات ختم نہیں ہوں گے بلکہ صرف اپنی جگہ تبدیل کریں گے۔ ایران نواز حوثیوں کی جانب سے بحیرۂ احمر میں جہازوں پر حملے اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ بحری عدمِ تحفظ اب سعودی عرب کی مغرب کی جانب اس نئی حکمتِ عملی کے لیے ایک ثانوی مسئلہ نہیں بلکہ بنیادی رکاوٹ بن جائے گا۔

ایران جنگ نے متحدہ عرب امارات کے ساتھ اختلافات کو مزید گہرا کر دیا ہے۔ بحیرۂ احمر سے متعلق اپنے عزائم کو لاحق بحری خطرات ہی اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ سعودی عرب ایران کے خلاف جنگ میں براہِ راست شریک ہونے سے کیوں گریزاں ہے اور مزید کشیدگی کے خلاف سفارتی کوششیں کیوں کر رہا ہے۔ سعودی قیادت جانتی ہے کہ اگر ایران کے حملوں کا عسکری جواب دیا گیا تو نہ صرف اس کے توانائی کے مراکز اور اہم تنصیبات خطرے میں پڑ جائیں گی بلکہ حوثیوں کی جنگ میں براہِ راست شمولیت بھی بڑھ سکتی ہے۔ ایسی صورت میں سعودی عرب کے متبادل برآمدی راستے بھی خطرے سے دوچار ہو جائیں گے، جس سے آبنائے ہرمز سے دور ہونے کی اس کی پوری حکمتِ عملی کمزور پڑ سکتی ہے۔

یہی پس منظر سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے ایران جنگ کے حوالے سے مختلف مؤقف کو آشکار کرتا ہے اور دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کا بھی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابوظہبی نے ایران کے خلاف سخت موقف اختیار کیا ہے، جو اپنے خلیجی پڑوسیوں کے مقابلے میں امریکا اور اسرائیل کے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے۔ اماراتی اعلیٰ حکام نے نہ صرف ایرانی قیادت کو اماراتی سرزمین پر حملوں کا ذمہ دار ٹھہرایا بلکہ اپنے علاقائی اتحادیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے مؤثر ردِعمل یا مناسب حمایت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

سعودی عرب اب اسرائیل اور اس کی پالیسیوں کو علاقائی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھنے لگا ہے، اسی لیے وہ اسرائیل کے ساتھ امارات کی قربت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ نتیجتاً امارات کا رویہ ریاض کے لیے بڑھتی ہوئی تشویش اور ناراضی کا باعث بن گیا ہے۔ اوپیک سے علیحدگی کا اماراتی فیصلہ، اگرچہ مکمل طور پر غیر متوقع نہیں تھا، تاہم سعودی عرب کے لیے ایک اور دھچکا ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ سعودی عرب اوپیک میں بدستور سب سے طاقتور کردار ادا کرے گا، مگر اب وہ واحد اور بڑا تیل پیدا کرنے والا ملک ہوگا جس کے پاس اضافی پیداواری گنجائش موجود ہے، اور ممکن ہے مستقبل میں اسے اماراتی پیداوار میں اضافے کی تلافی کے لیے اپنی پیداوار اور برآمدات کم کرنا پڑیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ بحیرۂ احمر میں اثر و رسوخ کے لیے دونوں ممالک کی مسابقت مزید شدت اختیار کرے گی۔ آبی گزرگاہ تک رسائی، اس کے راستوں اور اس کی سلامتی پر کنٹرول سعودی عرب کی معاشی اور تزویراتی حکمتِ عملیوں میں مرکزی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب متحدہ عرب امارات بحیرۂ احمر اور افریقا کے ''ہارن'' کے علاقے میں بندرگاہوں اور عسکری اڈوں کا ایک تزویراتی نیٹ ورک قائم کر رہا ہے تاکہ عالمی تجارتی راستوں کو محفوظ بنایا جا سکے اور اپنا معاشی اثر و رسوخ بڑھایا جا سکے۔

## ایک نئی تزویراتی سوچ

سعودی قیادت اس جنگ کو اپنے اخراجات کی ترجیحات تبدیل کرنے کے لیے بھی استعمال کر رہی ہے۔ جنگ سے پہلے ہی اس کے عظیم الشان منصوبوں پر نظرِ ثانی کا عمل جاری تھا، اور اب ایران کے ساتھ جنگ نے اسے مزید نمایاں تبدیلیاں کرنے کا ایک قابلِ قبول جواز فراہم کر دیا ہے۔

اب مملکت کی توجہ دوبارہ ان داخلی صنعتوں پر مرکوز ہو رہی ہے جو قومی ترقی اور معاشی سلامتی کے لیے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں۔ سعودی خودمختار سرمایہ کاری فنڈ ''پی آئی ایف'' نے بیرونِ ملک اپنے بعض نمایاں منصوبوں کو محدود کرنا شروع کر دیا ہے، جن میں "LIV Golf" اور نیویارک کی ''میٹروپولیٹن اوپیرا'' سے متعلق اسپانسرشپ اور شراکتیں شامل ہیں۔ اسی طرح اس نے سعودی عرب کے ممتاز فٹبال کلب ''الہلال'' میں اپنے بڑے حصص کی جزوی فروخت پر بھی اتفاق کیا ہے، جبکہ ''النصر''، ''الاہلی'' اور ''الاتحاد'' بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔ یہ تمام اقدامات زیادہ محتاط اخراجات، سخت مالی نظم و ضبط اور نمائشی منصوبوں سے دوری کی علامت ہیں۔

محمد بن سلمان نے یمن میں سعودی مداخلت سے دو نہایت تلخ سبق سیکھے: اول، جذباتی اور عجلت پر مبنی فیصلوں کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ دوم، دنیا میں کوئی جنگ ''مختصر'' نہیں ہوتی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ایران کے خلاف جنگ میں شریک ہونے یا اس کی کھل کر حمایت کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس کے برعکس سعودی عرب ایک مرتبہ پھر اپنی روایتی پالیسی کی جانب لوٹتا دکھائی دیتا ہے، جہاں جلدی فائدے حاصل کرنے کے بجائے احتیاط، صبر اور طویل المدتی تزویراتی پوزیشن کو ترجیح دی جاتی ہے۔ (مترجم: محمود الحق صدیقی)

"How the Iran war is reshaping Saudi strategy: From Hormuz and Houthis to the UAE's OPEC exit". ("chathamhouse.org". May 5, 2026)

## بقیہ: کیا تیل کا بحران زور پکڑے گا

اگر بہت جلد سفارتی محاذ پر کوئی بڑی پیشرفت ہو جائے تب بھی دنیا کو تیل کی کمی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے نپٹ کر مکمل بحالی کی طرف آنے میں کئی ماہ لگیں گے۔ کسی نہ کسی طور ایندھن کے صَرف کی راشننگ کرنا ہوگی۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ تیل کا بحران مکمل طور پر ختم ہونے سے پہلے شدت اختیار کرے گا اور اضافی پریشانیاں عنایت کرے گا۔

(مترجم: ابوصباحت)

"The crisis in oil markets will get bigger before it goes away". ("Economist". April 30, 2026)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی تازہ پیشکش

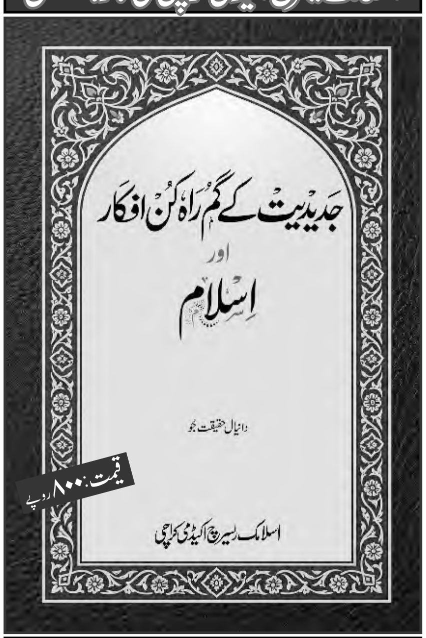


اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

# امریکا۔چین تصادم کا خدشہ

دنیا یہ سوچ سوچ کر پریشان ہے کہ کہیں امریکا اور چین کے درمیان جنگ نہ چھڑ جائے۔ تاہم پوری کوشش کی جارہی ہے کہ ایسا نہ ہو۔ بات سیدھی سی ہے کہ اگر دو بڑی طاقتیں ٹکرا گئیں تو دنیا کو تباہ ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ امریکا اور چین کے درمیان معاملات بگڑتے جارہے ہیں۔ کشیدگی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ پہلے معاملات تجارت تک محدود تھے۔ چین نے اپنی غیر معمولی معاشی قوت کے ذریعے امریکا کو بہت پریشان کیا ہے۔ پھر اُس نے عسکری قوت بڑھانے پر توجہ دی۔ اب وہ ہائی ٹیک کے میدان میں بھی تیزی سے بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ چین محض بنیا ذہنیت کے بل پر چلتا رہے گا۔ ایسا نہیں ہے۔

چین کے صدر شی جن پنگ نے خبردار کیا ہے کہ چین کو دبانے کی کوشش انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال میں دو بڑی طاقتوں کے درمیان تصادم ہوسکتا ہے۔ تھوسیڈائڈز ٹریپ کو آج کی صورتِ حال میں مقبولیت سے ہمکنار کرانے میں ہارورڈ کینیڈی اسکول کے بیلفر سینٹر سے تعلق رکھنے والے پروفیسر گراہم ایلیسن کا کردار کلیدی رہا ہے۔

یونان کے معروف تاریخ دان Thucydides سے موسوم یہ اصطلاح دراصل ایسی کیفیت کو بیان کرتی ہے جس میں کسی بڑی طاقت کے لیے خطرہ بننے والی نئی قوت معاملات کو جنگ کی طرف لے جاتی ہے۔ تھوسیڈائڈز نے یونان کی پیلوپونیسن جنگ کے تناظر میں لکھا تھا کہ ایتھنز کے عروج نے اسپارٹا میں خوف پیدا کیا اور اُس نے ایتھنز سے جنگ کو ناگزیر سمجھ لیا۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کبھی، کسی بھی صورتِ حال میں جنگ کی خواہش کسی تنازع کو جنم نہیں دیتی۔ ہاں، جب کسی بڑی قوت کے مقابل کوئی قوت پیدا ہو، پروان چڑھے اور عروج کا زمانہ دیکھتی دکھائی دینے لگے تب پہلے سے موجود قوت یہ سمجھتی ہے کہ اب اُس کی اجارہ داری اور برتری ختم ہونے کو ہے۔ یہ خوف اُسے جنگ کی طرف دھکیلتا ہے۔

جب بھی دنیا میں طاقت کے مراکز تبدیل ہونے لگتے ہیں تب معاملات جنگ کی طرف جاتے ہیں یا لے جاتے ہیں۔ بیلفر سینٹر کے تحت تاریخی معاملات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بیشتر معاملات میں یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی قوت ابھرتی ہے تو پہلے سے موجود قوت خوفزدہ ہوکر اُسے روکنے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ اتحاد تشکیل پاتے ہیں اور تنازعات شروع ہوتے ہیں۔ کم و بیش ۷۵ فیصد معاملات میں ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کسی عالمی قوت کے مقابل کوئی قوت ابھرتی ہے اور اُس کی بالادستی کے لیے خطرہ بنتی ہے تب معاملہ مسلح تصادم کی طرف جاتا ہے۔ طاقت کے مراکز کی تبدیلی کا مرحلہ خوف، تشویش اور مایوسی کی ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ معاملات کو بگڑنے سے روکنا انتہائی محال ہو جاتا ہے۔

تھوسیڈائڈز کے تصور یا نظریے کا ہر دور کے بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں اطلاق کیا جاتا رہا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں امریکا ابھرا تو یورپ کے لیے مسائل پیدا ہوئے مگر بہت جلد ختم ہوگئے کیونکہ دونوں کے درمیان مذہب، نسل اور ثقافت کی یکسانیت تھی۔ پھر دونوں نے مل کر باقی دنیا کو مٹھی میں لینا شروع کیا۔

فی زمانہ امریکا اور چین کے درمیان شدید کشمکش چل رہی ہے۔ ویسے تو یورپ بھی نرم قوت کے حوالے سے غیر معمولی رہا ہے مگر وہ امریکا کے لیے کبھی حقیقی خطرہ نہیں بنا کیونکہ دونوں نے بہت پہلے طے کرلیا تھا کہ مل کر باقی دنیا کو مٹھی میں دبوچے رکھنا ہے۔ چین کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ معاشیات، ٹیکنالوجی اور عسکری قوت کے حوالے سے دونوں کے درمیان غیر معمولی نوعیت کی رَسّا کشی پائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ بہت حد تک فطری ہے کیونکہ سوال محض چین کی طاقت کے بڑھنے کا نہیں بلکہ امریکا کی قوت کے گھٹنے کا بھی ہے۔ امریکی قیادت یعنی اسٹیبلشمنٹ کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ ملک کی طاقت گھٹ رہی ہے اور دوسری طرف چین مضبوط تر ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں بدحواسی کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ یہ بدحواسی کبھی کبھی اچانک بہت زیادہ بڑھی ہوئی لگتی ہے۔ تب متعلقین تیزی سے متحرک ہوکر معاملات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضرورت محسوس ہو تو چوٹی کی ملاقات بھی ہوتی ہے یعنی دونوں ملکوں کے صدور بھی ملاقات کرلیتے ہیں تاکہ دنیا کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملے۔

ہارورڈ کینیڈی اسکول نے انتباہ کیا ہے کہ ہر سوڈیڑھ سو سال کے بعد طاقت کی تبدیلی کا مرحلہ آتا ہے اور کچھ نہ کچھ ہوکر رہتا ہے۔ اِس وقت امریکا اور چین کے درمیان جو کچھ بھی چل رہا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے طاقت کی تبدیلی کا مرحلہ یا عمل ہے۔ ایسے میں کبھی کبھی معاملات اِتنے نازک ہو جاتے ہیں کہ محض ایک چھوٹا سا واقعہ، ایک معمولی سی غلطی بہت بڑی یا عالمی جنگ کے فیتے کو آگ لگا سکتی ہے۔

جنگ ہر حال میں ناگزیر نہیں ہوتی۔ اگر بات چیت کا ماحول بناکر رکھا جائے، ایک دوسرے کو گنجائش دینے کی راہ نکالی جاتی رہے تو بہت سے معاملات کو خطرناک شکل اختیار کرنے سے قبل قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ قائدین پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

امریکا اور چین کی قیادت اِس وقت نفسیاتی اور اعصابی جنگ میں مصروف ہیں۔ فریقین کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ طاقت کے کھیل کی روایت اپنی جگہ اور پیشرفت کے اعتبار سے بدلی ہوئی دنیا اپنی جگہ۔ آج کی دنیا میں کوئی بھی اقدام سوچے سمجھے بغیر محض طاقت کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ امریکا اور چین کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ دونوں کے پاس اِتنی طاقت ہے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھاسکتے ہیں۔ امریکا ہائی ٹیک میں بالادستی یا برتری کا حامل ضرور ہے مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ چین کو تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرسکتا ہے۔ چین بھی جانتا ہے کہ امریکا کو زیر کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ ہاں، امریکا کو پریشان کرکے وہ اپنے مفادات کا تحفظ ضرور یقینی بناسکتا ہے۔ اور وہ ایسا ہی کررہا ہے۔

طاقت کے مراکز کی تبدیلی کا یہ موسم پوری دنیا کے سیاسی، سفارتی، معاشی اور معاشرتی ماحول کو انتشار سے دوچار کررہا ہے۔ چھوٹے ممالک کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اسٹریٹجک لڑائیوں میں وہ کسی گنتی ہی میں نہیں۔ بڑی طاقتیں اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق نچارہی ہیں۔ امریکا اور یورپ نے مل کر کئی خطوں کو کم و بیش ۲ صدیوں تک اپنی مرضی کے مطابق چلایا اور پھر بیسویں صدی کے اوائل میں ایک نئی، ترقی یافتہ دنیا کے ابھرنے پر ان دونوں خطوں نے طریقہ تبدیل کیا۔ اب اِن دونوں نے مل کر پسماندہ ملکوں کو فتح کرنے اور اُن پر قابض ہونے کے بجائے، اُن کی معیشتوں پر قابض ہوکر اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کروانا شروع کیا۔ اپنے پٹھو بٹھاکر ان پسماندہ ملکوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کا سلسلہ بہت حد تک اب بھی جاری ہے۔ امریکا اور یورپ نے

\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۶ //////

# ترکیہ: طرزِ حرب بدلنے والی ٹیکنالوجی کی نمائش

افتخار گیلانی

ترکیہ کے عروس البلاد استنبول کے ایکسپو سینٹر کے باہر گاڑیوں کی قطاریں اس قدر طویل ہو چکی تھیں کہ بعض مندوبین نے ٹریفک میں پھنسے رہنے کے بجائے اپنی گاڑیاں وہیں چھوڑ دیں اور نمائش گاہ کی طرف پیدل ہی چل پڑے۔

عسکری قافلے سکیورٹی کی متعدد تہوں اور رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے انتہائی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے، جبکہ فضا میں ہیلی کاپٹر مسلسل چکر کاٹ رہے تھے۔ یہ سبھی ترکیہ کی تاریخ کی اب تک کی سب سے بڑی دفاعی اور فضائی نمائش ۲۰۲۶ء کی طرف رواں تھے۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ نمائش کے وسیع و عریض ہال افریقی ممالک کے تمغہ پوش جنرلوں، خلیجی شہزادوں، نیٹو کے اعلیٰ افسران اور ایشیائی ممالک کے خریداری وفود سے بھر چکے تھے۔

ان کے ساتھ ساتھ ترکیہ کے مشہور زمانہ دفاعی ادارے 'بایکار' کی سیاہ جیکٹیں پہنے انجینئر، خفیہ بریفنگ فولڈرز اٹھائے سفارت کار اور عربی، ترکی، انگریزی، روسی اور فرانسیسی زبانوں میں گفتگو کرتے کاروباری حضرات ایک منفرد عالمی منظر پیش کر رہے تھے۔

ہال نمبر ۸ کے اندر، شرکاء کا ہجوم ایک ایسی چیز کے گرد جمع تھا جو آنے والے کئی دنوں تک عالمی دفاعی مباحثوں کا محور بننے والی تھی۔ یہ ترکیہ کے پہلے بین البراعظمی بیلسٹک میزائل (آئی سی بی ایم) یلدرم خان کی رونمائی کی تقریب تھی۔

ترک حکام کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق، یہ میزائل ۶ ہزار کلومیٹر سے زائد کے فاصلے تک اپنے ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے اور یہ ہائپرسونک رفتار یعنی آواز کی رفتار سے تقریباً ۲۵ گنا زیادہ کی رفتار حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

گزشتہ کئی برسوں سے ترکیہ کے دفاعی عروج کو ڈرونز، خودکش گولہ بارود سے منسوب کیا جاتا رہا ہے جن کی کامیابی کی دھاک لیبیا، شام، ناگورنو کاراباخ اور یوکرین کے معرکوں میں بیٹھ چکی ہے۔ لیکن ایک بین البراعظمی بیلسٹک میزائل کی نمائش کسی بہت بڑی جست کی علامت تھی۔ یہ طویل فاصلے تک اسٹریٹجک ڈیٹرنس یعنی دفاعی توازن کے اس مخصوص اور خصوصی حلقے میں داخل ہونے کی ایک شعوری کوشش تھی جو تاریخی طور پر صرف دنیا کی چند بڑی عسکری طاقتوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا رہا ہے۔

نمائش کے اندر کا ماحول یہ واضح کر رہا تھا کہ یہ کوئی عام اسلحہ میلہ نہیں تھا۔ جولائی میں انقرہ میں منعقد ہونے والے نیٹو کے انتہائی اہم سربراہی اجلاس سے محض چند ماہ قبل یہ ایک ایسا اسٹیج ترتیب دیا گیا تھا، جہاں ترکیہ اپنے آپ کو محض نیٹو کے ایک اور رکن کے طور پر نہیں، بلکہ ایک غیر مستحکم عالمی نظام کے اہم ترین اور کلیدی حفاظتی ستون کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

پچھلے سال ہوئی ہندوستان۔پاکستان جنگ، روس اور یوکرین جنگ، اور حال ہی میں ہوئے امریکا۔ایران تصادم کی چھاپ اس نمائش پر گہری دکھائی دے رہی تھی۔

مختلف اسٹالوں پر موجود دفاعی انجینئروں سے گفتگو کرتے ہوئے پتا چلا کہ ان تصادموں نے سرد جنگ کے بعد کے عسکری نظریات کے اس مرکزی مفروضے کو چکنا چور کر دیا ہے کہ غیر معمولی روایتی فوجی برتری ہی ہمیشہ حتمی اور فیصلہ کن فتح کی ضمانت ہوتی ہے۔

ان کے مطابق حالیہ جنگوں نے ثابت کیا ہے کہ اب سستے ڈرونز اربوں ڈالر مالیت کے بکتر بند دستوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ الیکٹرانک وارفیئر یعنی برقیاتی حرب ایک بڑی اور جدید ترین افواج کو اندھا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

خودکار حملہ آور نظام انتہائی جدید فضائی دفاعی باڑوں کو تہس نہس کر سکتے ہیں۔ سمندری راستوں پر موجود تزویراتی رکاوٹیں کسی بھی ملک کی بحری برتری کو بے اثر کر سکتی ہیں۔ مزید برآں، طویل جنگیں طاقتور معیشتوں کو بھی سیاسی اور نفسیاتی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ یہ وہ سبق تھا جو نمائش گاہ کے در و دیوار میں پوری شدت کے ساتھ گونج رہا تھا۔

افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیر دفاع یاشار گولر نے ترکیہ کی عسکری توسیع کو براہِ راست یوکرین اور ایران کے تنازعات سے جنم لینے والے تیزی سے بدلتے ہوئے سکیورٹی ماحول سے جوڑا۔

انہوں نے استدلال کیا کہ اب وہ دور گیا جب ممالک صرف روایتی فوجی سوچ پر بھروسا کر سکتے تھے۔ یہ ایسا عہد ہے جہاں ڈرون وارفیئر، الیکٹرانک حملے اور مصنوعی ذہانت (اے آئی) تیزی سے میدانِ جنگ کے نتائج کا فیصلہ کر رہے ہیں۔

نمائش کے تعارفی مواد میں بتایا گیا کہ یوکرین کی جنگ نے دکھا دیا کہ کس طرح معمولی قیمت کے ڈرونز لاکھوں ڈالر مالیت کے ٹینکوں، توپ خانے کے نظام اور بحری اثاثوں کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

ترک اسٹریٹجک ماہرین کے مطابق، ایران پر مسلط کردہ حالیہ امریکا۔اسرائیل تصادم نے طویل فاصلے تک مار کرنے والے دفاعی نظاموں اور سمندری خودمختاری کی تزویراتی اہمیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

جنوبی ایشیا کے مبصرین کے لیے یہ ریمارکس خاصی اہمیت کے حامل تھے۔ ۲۰۲۵ء کے پاک۔بھارت تصادم نے بھی اسی طرح واضح کیا کہ جدید جنگیں کس تیزی سے فوجی برتری کے روایتی حساب کتاب سے آگے نکل سکتی ہیں۔

درست نشانے والے ڈرونز اور الیکٹرانک وارفیئر نے جنگ کی شدت اور پھیلاؤ کی حرکیات کو پیچیدہ بنا دیا ہے جس کا روایتی عسکری نظریات میں مکمل ادراک موجود نہ تھا۔

ان جنگوں کا مطالعہ کرنے والے ترک ماہرینِ حرب اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ مستقبل کے تنازعات بیسویں صدی کی صنعتی جنگوں جیسے نہیں ہوں گے۔ اس کے بجائے، وہ ایک ایسے غیر مرکزی میدانِ جنگ کو دیکھ رہے ہیں جو خودکار نظاموں، الیکٹرانک خلل، سوارم ٹیکنالوجیز یعنی ڈرونز کے جھنڈ اور کم لاگت مگر درست ترین حملوں سے عبارت ہوگا۔

اس اہم نمائش میں ترکیہ نے خود کو ایک ایسے ملک کے طور پر پیش کیا جو اس بڑی تبدیلی کے لیے بھرپور اور جارحانہ انداز میں تیاری کر رہا ہے۔ نمائش کی وسعت بذاتِ خود ان عزائم کی عکاس تھی۔

اس نمائش میں ۱۲۰ سے زائد ممالک کی ۱۷۶۰ سے زیادہ کمپنیوں نے شرکت کی، جن میں تقریباً ۱۵۰۰ ترک ادارے اور ۲۶۳ غیر ملکی کمپنیاں شامل تھیں۔

چھ روز میں ترکیہ کی دفاعی اور خلائی صنعت سے وابستہ کمپنیوں نے تقریباً ۱۸۲ معاہدوں اور مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کیے، جس سے قریب ۸ ارب ڈالر کا کاروباری حجم پیدا ہوا، جس میں سے تقریباً ۶ ارب ڈالر براہِ راست برآمدات سے منسلک تھے۔

اس میلے کے دوران معاہدوں پر دستخط کی ۱۶۴ تقریبات

منعقد ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایرواسپیس، بحری جنگ، خودکار نظاموں، سائبر ٹیکنالوجیز اور الیکٹرانک وارفیئر کے شعبوں میں ۲۰۳ سے زیادہ نئی مصنوعات منظرِ عام پر لائی گئیں۔

تاہم، اس دفاعی میلے کی اصل اہمیت محض اعداد و شمار میں نہیں بلکہ اس انتخاب میں پوشیدہ تھی کہ ترکیہ نے دنیا کے سامنے کن چیزوں کو پیش کیا۔

نمائش کے فرش پر پھیلی مصنوعات ایک ایسے ملک کی تصویر پیش کر رہی تھیں جسے اب پختہ یقین ہو چکا ہے کہ اکیسویں صدی میں عسکری طاقت محض ان ریاستوں کے پاس نہیں ہوگی جن کی فوجیں بڑی ہیں، بلکہ ان کے پاس ہوگی جو ان ٹیکنالوجیز کو تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو مستقبل کے میدانِ جنگ کی سمت متعین کریں گی۔

یہ تبدیلی ترکیہ کی مشہورِ زمانہ ڈرون کمپنی 'بایکار' کے اسٹینڈ پر سب سے زیادہ نمایاں تھی، جس کے بنائے ہوئے نظام دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ کمپنی کے پرہجوم اسٹینڈ پر زائرین نے، حال ہی میں منظرِ عام پر آنے والے 'مزراق' لوئیٹرنگ میونیشن خودکش ڈرون، کے۔۲ کامیکازے یواے وی اور سوری سَنیک ٹیکٹیکل ڈرون کا مشاہدہ کیا۔

بایکار کے حکام نے بارہا ان نظاموں کو مستقبل کی جنگوں کے لیے تیار کردہ ٹیکنالوجی قرار دیا۔ ان ڈرونز کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ یہ سیٹلائٹ مواصلاتی نظام کے جام و ناکارہ ہونے پر بھی کام کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بایکار کے انجینئرز کے مطابق، مصنوعی ذہانت سے لیس مزراق خودکش ڈرون ۱۰۰۰ کلومیٹر سے زائد کی رینج رکھتا ہے اور ۴۰ کلوگرام سے زائد بارودی مواد لے جانے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی جی پی ایس کے بغیر آزادانہ طور پر ہدف تک پہنچنے کی صلاحیت ہے، جس نے ان غیر ملکی وفود کی خاصی دلچسپی پیدا کی جو یوکرین اور مشرقِ وسطیٰ میں الیکٹرانک وارفیئر کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوریوں سے پریشان تھے۔

جنوبی مشرقی ایشیا اور خلیجی ممالک کے وفود کو ڈرون سوارم یعنی جھنڈ کو آرڈینیشن سافٹ ویئر کا مظاہرہ دکھاتے ہوئے ایک ترک انجینئر نے وضاحت کی کہ مستقبل کا میدانِ جنگ ان خودکار نظاموں کا ہے جو مواصلاتی نظام کی مکمل معطلی کے باوجود بچ نکلنے اور اپنا مشن پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اگرچہ ڈرون وارفیئر کے ارتقا کا موضوع ہر گفتگو پر چھایا رہا، لیکن ایسا لگا کہ ترکیہ کے عزائم اب فضائی نظاموں سے کہیں آگے تک پھیل چکے ہیں۔

اس نمائش سے ابھرنے والا ایک اہم ترین موضوع زیرِ آب قلمرو کی عسکری قوت میں تبدیلی تھا۔ ترکیہ کے دفاعی ادارے 'ایسلسان' نے 'قلیچ' (کیلی۔سی ۷) کے نام سے ترکیہ کی پہلی خودکار زیرِ آب کامیکازے گاڑی متعارف کرائی۔

اس کے ساتھ ہی طوفان نامی بغیر ملاح کے سطحِ آب پر چلنے والے بحری جہاز کی نمائش کی گئی، جسے بحری سوارم حملوں کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔

ان نظاموں کو ترکیہ کی پھیلتی ہوئی 'بلیو ہوم لینڈ' یعنی 'ماوی وطن' کے ڈاکٹرائن کے طور پر پیش کیا گیا، جو بحیرۂ روم، بحیرۂ اسود اور قریبی آبی گزرگاہوں پر اپنی بحری طاقت کے اظہار اور دو سو کلومیٹر کی حدود تک خصوصی اقتصادی زون پر اپنے دعوے پر زور دیتی ہے۔ ماہرین اس خودکار بحری جنگ کی تزویراتی اہمیت کو ایران سے متصل آبنائے ہرمز اور بحیرۂ احمر کی تجارتی گزرگاہوں میں حالیہ تناؤ سے جوڑ کر دیکھ رہے تھے۔

یہ نظریہ ہندوستان کے لیے بھی بلاواسطہ مضمرات کا حامل ہے، جس کی بنیادی وجہ مجوزہ 'انڈیا۔مڈل ایسٹ۔یورپ اکنامک کوریڈور' (آئی ایم ای سی) ہے۔ ترک تزویراتی ماہرین کا استدلال ہے کہ یہ راہداری، 'ماوی وطن' کے طور پر ترکیہ کے سمندری حدود سے گزرنے کے باوجود، دانستہ طور پر اسے نظرانداز کرتی ہے۔

اس سمندری رہگزر میں ہندوستان، متحدہ امارات، سعودی عرب، اردن، اسرائیل اور یونان شامل ہیں۔ چنانچہ، ترک تجزیہ کار اس تجارتی راستے کی طویل المدتی افادیت اور سیکورٹی پر سوال اٹھا رہے ہیں جو ایک طرف تو ترکیہ کو پسِ پشت ڈالتا ہے، مگر دوسری طرف انہی سمندری حدود سے گزرتا ہے جہاں ترک بحریہ ایک جارحانہ، مستحکم اور تکنیکی لحاظ سے انتہائی جدید ترین موجودگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

ترک دفاعی کمپنی ایس ٹی ایم کے جنرل منیجر اوزگور گلیریز مجھے بتا رہے تھے کہ بڑے پیمانے پر ہونے والے ڈرون حملوں کو روکنے کے لیے روایتی میزائل ڈیفنس سسٹم اکثر بہت مہنگے ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے لیزر پر مبنی ایک پلیٹ فارم تیار کیا گیا ہے جسے اسٹیل ڈوم کا نام دیا گیا ہے، اور جسے روایتی میزائل انٹرسیپٹرز کے مقابلے میں انتہائی کم لاگت پر ڈرون جھنڈوں کو بے اثر کرنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔

عسکری تجزیہ کاروں نے بارہا یاد دلایا کہ یوکرین اور مشرقِ وسطیٰ کے تنازعات نے یہ حقیقت عیاں کر دی ہے کہ ڈرونز کے مسلسل حملوں کے نتیجے میں مہنگے انٹرسیپٹر میزائلوں کے ذخائر کس تیزی سے ختم ہو سکتے ہیں۔ ایسے میں لیزر سسٹمز ممکنہ طور پر ایک بہت ہی سستا متبادل فراہم کرتے ہیں۔

تاہم، جو چیز اس نمائش کو مغربی دفاعی نمائشوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ اس کے گرد بنا گیا وسیع تر سیاسی بیانیہ تھا۔ ترک حکام کے لیے دفاعی شعبے میں مقامی سطح پر خودکفالت اب محض ایک ضرورت نہیں بلکہ قومی خودمختاری کا لازم و ملزوم حصہ بن چکی ہے۔

تین دہائیاں قبل، ترکیہ اپنی دفاعی ضروریات کا تقریباً ۸۰ فیصد حصہ یورپ اور امریکا سے درآمد کرتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لگنے والی پابندیوں، خریداری کے تنازعات اور سیاسی رکاوٹوں نے آخر کار انقرہ کو اس بات پر قائل کر لیا کہ دوسروں پر انحصار اسٹریٹجک خطرات کا حامل ہے۔

تب سے اب تک آنے والی تبدیلی غیر معمولی ہے۔ ترک حکام کے مطابق، اب ملکی صنعتیں ملک کی دفاعی ضروریات کا ۸۰ فیصد سے زائد حصہ خود پورا کر رہی ہیں۔ صدر رجب طیب اردوان نے دفاعی صنعت کو ایک ایسے 'ایکو سسٹم' سے تشبیہ دی جس کی نہ صرف خطے بلکہ عالمی سطح پر بھی مانگ ہے اور جس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

'ہمیں لاتعداد رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں (مغرب) نے پابندیوں کے ذریعے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ہمیں اندرونی غداریوں اور سازشوں کا نشانہ بھی بنایا گیا۔'

دو دہائی قبل جو یورپ ترکیہ کو آلاتِ حرب و ضرب دینے پر پابندی لگا رہا تھا، اب خود دفاعی ٹیکنالوجی کے لیے ترکیہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جرمنی، اسپین، ہنگری، فرانس اور اٹلی جیسے ممالک کے ماہرین مختلف دفاعی مصنوعات کی خریداری پر گفت و شنید کر رہے تھے۔

ترک کمپنیاں اب یورپ کو ایک 'سپلائر مارکیٹ' کے بدلے اپنی برآمدات کی منزل اور ایک ممکنہ سیکیورٹی پارٹنر کے طور پر دیکھتی ہیں۔ جرمن وزیر دفاع نے بتایا کہ ان کا ملک امریکی ٹام ہاک میزائل کے متبادل کے بطور ترکیہ کے یلدرم خان میزائل خریدنے کی خواہش رکھتا ہے۔

سرد جنگ کے بعد کئی دہائیوں تک، بہت سے یورپی ممالک نے اس مفروضے پر دفاعی اخراجات میں مسلسل کمی کی کہ امریکی فوجی تحفظ مستقل اور غیر متزلزل رہے گا۔ نمائش میں شریک نیٹو کے کئی تجزیہ کاروں نے نجی محفلوں

میں اس بات کا اعتراف کیا کہ یورپ کا دفاعی وصنعتی ڈھانچا اب بھی لاجسٹک، انٹیلی جنس اور اسٹریٹجک نظاموں کے لیے بڑے پیمانے پر امریکا کا محتاج ہے۔

ترکیہ نے اس کے برعکس ایک بالکل مختلف راستہ اختیار کیا۔ سرد جنگ کے بعد فوجی سرمایہ کاری کم کرنے کے بجائے، انقرہ نے دفاعی تحقیق اور ترقی (آر اینڈ ڈی) کے اخراجات میں مستقل اضافہ کیا۔

آج، ترک کمپنیاں ۱۸۵/ممالک کو ۲۳۰ سے زائد اقسام کے دفاعی نظام برآمد کر رہی ہیں۔ سال بہ سال ۴۸ فیصد اضافے کے بعد ۲۰۲۵ء میں دفاعی برآمدات ۱۰/ارب ڈالر کے ہندسے کو عبور کر گئیں۔

بتایا گیا کہ یورپ کے دس ایسے ممالک ہیں جن کے پاس کوئی ٹینک ہی نہیں ہے۔ برطانیہ جو ایک وقت ایک بڑی بحری طاقت ہوا کرتا تھا، کے پاس اب جنگ کے قابل سمندری جہاز ہی نہیں ہیں۔ اس لیے امریکا کے انخلا کے بعد یورپ سیکورٹی کے لیے ترکیہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔

عالمی نمائش کے دوران ترکیہ نے پاکستان کے ساتھ بھی خاموشی سے اپنے مذاکرات کا دائرہ وسیع کیا۔ اگرچہ ساہا کے اسٹیج سے عوامی سطح پر پاکستان کے لیے کسی بڑے دفاعی معاہدے کا اعلان نہیں کیا گیا، تاہم ترک اور پاکستانی دفاعی حکام کے درمیان اعلیٰ سطحی ملاقاتیں ہوئیں۔

نمائش کے دوران غیر رسمی طور پر لڑاکا طیاروں میں تعاون، بحری نظاموں، یواے وی ٹیکنالوجیز اور ایوی اونکس کے شعبوں میں جاری متعدد منصوبوں پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا۔

ہندوستان کے لیے ان پیش رفتوں کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ مسلم اکثریتی ممالک میں انقرہ کا پھیلتا ہوا اثر و رسوخ، اسے وسیع تر ایشیائی سیکورٹی حرکیات میں ایک کلیدی اسٹریٹجک کھلاڑی کے طور پر کھڑا کر رہا ہے۔ 'ساہا ۲۰۲۶ء' نے اس بدلاؤ کو پوری شدت سے محسوس کیا۔

جب مندوبین رات گئے نمائش کے ہالوں سے رخصت ہو رہے تھے، تو بڑی اسکرینوں پر خودکار ڈرون جھنڈوں، زیرِ آب حملے کے نظاموں اور ہائپرسونک میزائلوں کے سمولیشنز کی فوٹیج مسلسل چل رہی تھی۔

انقرہ نے استنبول سے جو پیغام دیا، وہ بالکل واضح تھا۔ مستقبل کا میدانِ جنگ شاید اب خودبخود امیر ترین طاقتوں یا بڑی فوجوں کی جاگیر نہیں رہے گا۔ یہ ان ممالک کا ہو سکتا ہے جو مستقبل کی جنگوں کے مطابق خود کو تیزی سے ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حالیہ جنگوں نے کئی درمیانی درجے کی طاقتوں کو قائل کر دیا ہے کہ پابندیوں، تکنیکی حربوں اور غیر مستحکم اتحادوں پر مبنی اس بکھرے ہوئے عالمی نظام میں اب صرف روایتی اتحاد سیکورٹی کی کافی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔

یہ نمائش محض ہتھیاروں کے بارے میں نہیں تھی، بلکہ یہ ترکیہ کے اندر ابھرنے والے ایک نئے جیوپولیٹیکل تخیل کی عکاس تھی۔ ایک ایسا ملک جو نیٹو کے حاشیے پر کھڑے ایک دفاعی درآمد کنندہ سے ارتقا پا کر ایک ایسی تکنیکی عسکری قوت بن رہا ہے جو اب یورپ سے جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ سے افریقا تک کے سیکورٹی توازن پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

'یلدرم خان' جیسے شاہکار اور 'بلیو ہوم لینڈ' جیسے نظریات ثابت کرتے ہیں کہ آنے والے برسوں میں ترکیہ عالمی بساط پر ایک خاموش تماشائی نہیں بلکہ ایک فیصلہ کن کھلاڑی بن کر ابھرے گا۔

دنیا اب بدل رہی ہے، اور اس نئی دنیا میں دفاع کا مطلب اب صرف سرحدوں کی حفاظت نہیں بلکہ ٹیکنالوجی کی وہ بالادستی ہے جو دشمن کے ارادوں کو میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے ہی مغلوب کر دے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۰مئی ۲۰۲۶ء)

## بقیہ: امریکا۔چین تصادم کا خدشہ

یوں ڈھائی تین صدیوں کے دوران جی بھر کے مزے لُوٹے ہیں۔ اب بہت کچھ تبدیل ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

چین کے صدر شی جن پنگ نے امریکی ہم منصب سے حالیہ ملاقات اور بات چیت کے دوران تھوسیڈائڈز ٹرپ کا خاص طور پر ذکر کیا اور اس نکتے پر زور دیا کہ امریکا اور چین کو ہر حال میں براہِ راست مسلح تصادم سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ دو بڑی عالمی طاقتیں ٹکرا گئیں تو بہت بڑے پیمانے پر تباہی رونما ہوگی۔ دونوں کے قائدین اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

بحیرۂ جنوبی چین، تائیوان، اے آئی اور دیگر امور پر امریکا اور چین کے درمیان تناؤ اِس وقت نقطۂ عروج پر دکھائی دے رہا ہے۔ ایسے میں کوئی معمولی سی غلطی بھی بہت بڑا بحران کھڑا کر سکتی ہے۔ ایسے میں دونوں بڑی طاقتوں کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔ دنیا اِن سے دانش اور تحمل کی توقع رکھتی ہے۔

(یہ مضمون نیوز فیڈ اور ویب سائٹس کے تجزیوں سے تیار کیا گیا ہے۔۔۔ تلخیص وتدوین: ابوصباحت)

## بقیہ: پاکستانی جین زی: ذہنی دباؤ کا بڑھتا بحران

جڑے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں جذباتی طور پر تنہا ہوتے ہیں۔ یہی تنہائی ذہنی دباؤ کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ان حالات میں خاندان کے بزرگوں، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق ترکی میں ایسے بزرگوں کو جو خاندان کے بچوں کی پرورش و دیکھ بھال میں مددگار رہوں، حکومت انہیں وظائف دیتی ہے۔

اس صورتِ حال کا ایک مثبت پہلو یہ ضرور ہے کہ نئی نسل ذہنی صحت کے مسائل کو پہچاننے اور ان پر گفتگو کرنے لگی ہے۔ یہ تبدیلی ضروری بھی تھی کیونکہ خاموشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ تاہم صرف شکایات درج کرنے یا ہنگامی خدمات کا نظام قائم کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اصل ضرورت ایک ایسے معاشرتی ماحول کی ہے جہاں نوجوان خود کو محفوظ، باعزت اور امید سے بھرپور محسوس کریں۔

ہمارے تعلیمی اداروں، خاندانوں، مذہبی حلقوں اور حکومتی اداروں کو مل کر نوجوان نسل کے لیے ایسا ماحول بنانا ہوگا جہاں اخلاقی تربیت، جذباتی معاونت، معاشی مواقع اور محفوظ ڈیجیٹل ماحول فراہم کیا جا سکے۔ نوجوانوں کو صرف نصیحت کی نہیں بلکہ سنجیدہ توجہ، اعتماد اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے اس نسل کے ذہنی اور سماجی مسائل کو نظرانداز کیا تو مستقبل میں اس کے اثرات صرف انفرادی نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی محسوس کیے جائیں گے۔

پاکستان کی نوجوان نسل ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر اسے امید، تحفظ اور مقصد فراہم کر دیا جائے تو یہی نسل ملک کی سب سے بڑی طاقت بن سکتی ہے، لیکن اگر اسے تنہائی، خوف، بے یقینی اور ذہنی دباؤ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو یہ بحران آنے والے برسوں میں مزید گہرا ہو سکتا ہے۔

## بقیہ: نئے ورک کلچر کی تلاش

افلاسِ وقت محض ذاتی نوعیت کا مسئلہ نہیں۔ یہ تو اب پورے معاشرے اور کاروباری ماحول پر محیط چیلنج ہے جس کے ہاتھوں انسان تھکن سے بھی دوچار ہوتا ہے اور اپنے وقت کو ڈھنگ سے بروئے کار لانے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اِس حوالے سے حکومتوں اور کاروباری اداروں کو مل کر سوچنا چاہیے تاکہ کوئی جامع اور قابلِ عمل حل تلاش کیا جا سکے۔

(ترجمہ وتدوین: ابوصباحت)

"Americans are suffering from time poverty". ("Newsweek". Jun 12, 2025 & "wikipedia.org".)

# کیا تیل کا بحران زور پکڑے گا

جس کے واقع ہونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، وہ اب اختتام کی منزل تک پہنچتا دکھائی نہیں دے رہا۔ تیل کے عالمی تاجروں کا خیال تھا کہ امریکا اور اسرائیل کی طرف سے عسکری کارروائیوں کے باوجود ایران آبنائے ہرمز بند نہیں کرے گا اور عالمی سطح پر تیل کا بحران پیدا نہیں ہوگا۔ اُن کا خیال تھا کہ آبنائے ہرمز بند کرنے سے خلیجِ فارس کے خطے میں ایران کے پڑوسی برہم ہوں گے۔ ایسی صورت میں خلیجی ممالک کے وہ ایشیائی کسٹمرز متاثر ہوں گے جو اُن سے تیل خریدتے ہیں۔ تیل کی برآمد خلیجی ممالک کی معیشت کے لیے سب سے بڑی لائف لائن ہے۔ تیل کے عالمی تاجروں کا خیال تھا کہ اگر ایران نے آبنائے ہرمز بند بھی کی تو امریکا اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر اِسے فوری طور پر کُھلوا دے گا۔

ایران پر اسرائیل اور امریکا کے مشترکہ حملوں کی ابتدا کے ڈھائی ماہ بعد بھی آبنائے ہرمز میں ٹریفک کم و بیش صفر کے مساوی ہے۔ ایران نے وہاں سے گزرنے والے تیل بردار اور مال بردار جہازوں کو نشانہ بنایا ہے جس کے نتیجے میں عالمی تجارت بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ آبنائے ہرمز کو مکمل طور پر کُھلوانے کی سفارتی کوششیں اب تک نامکمل اور غیر نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ اس معاملے کا جامع سفارتی حل بھی ممکن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ ایران اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے آبنائے ہرمز کو مستقل طور پر بھی بند کرسکتا ہے۔ تیل کی عالمی قیمتوں پر ایک نظر ڈالیے اور پھر دیکھیے کہ اس حوالے سے جو ردِعمل دکھائی دینا چاہیے تھا، وہ اب تک ناپید ہے۔ ایران کو آبنائے ہرمز کھولنے پر آمادہ کرنا آسان کام نہیں۔ وہ ڈٹا ہوا ہے، اَڑا ہوا ہے۔ چند ہفتوں کے دوران تیل کی قیمتوں میں اضافے کے بعد بھی برینٹ کروڈ کی قیمت ۱۲۰ ڈالر فی بیرل تک پہنچی ہے جبکہ مارچ میں ماہرین نے پیش گوئی کی تھی کہ آبنائے ہرمز مستقل بند رہنے کی صورت میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمت ۱۵۰ سے ۲۰۰ ڈالر فی بیرل تک پہنچ سکتی ہے۔ ایشیا کے بہت سے ممالک میں معیشتی انحطاط کی ابتدا ہوچکی ہے۔ عوام کو پریشانی کا سامنا ہے جبکہ ترقی یافتہ اور خوشحال ممالک میں عوام کے معیارِ زندگی پر کچھ خاص اثر مرتب نہیں ہوا ہے۔ دنیا بھر میں پٹرول کی قیمت بڑھنے سے عام آدمی کے لیے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ فضائی کرائے بڑھ گئے ہیں۔ اِس کے باوجود معاشی نمو سے متعلق پیش گوئیوں میں ماہرین زیادہ مایوس دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ بہرکیف، اس وقت دنیا بھر کی معیشتوں کو تیل کی رسد میں غیر معمولی کمی کا سامنا ہے۔

معاشی منڈیاں ہمیشہ توازن حاصل کرلیتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کس سطح پر اور کب۔ جب روس نے یوکرین پر جنگ مسلط کی تو مغربی ممالک نے روس سے تیل خریدنا بند کردیا تب تیل کی قیمت ۱۲۹ ڈالر فی بیرل تک جا پہنچی اور عالمی سطح پر تیل کا بحران بھی پیدا نہیں ہوا۔ اور کساد بازاری کے بھی آثار دکھائی نہیں دیے۔ تیل کی عالمی سپلائی میں روس کا حصہ محض ۳ فیصد رہا ہے جو ۳۰ لاکھ بیرل یومیہ ہے۔ مغرب نے جو تیل خریدنا بند کردیا، روس نے وہی تیل ایشیائی ممالک کی طرف روانہ کرنا شروع کیا۔ جب سے ایران نے آبنائے ہرمز کو بند کیا ہے، تیل کی عالمی رسد سے اِس کا پانچ گنا تیل غائب ہوگیا ہے۔ تیل کی رسد میں اِتنی بڑی کمی کو تادیر برداشت یا ہضم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ سب کچھ یونہی چلتا رہا تو دنیا ایک بہت بڑے معاشی بحران سے بہت زیادہ دور نہیں۔

## خام تیل کا حساب کتاب

کسی بھی ہنگامی کیفیت میں معاشی منڈیاں گڑبڑ کا شکار ہوتی ہیں۔ اس وقت تیل کا بحران دھیرے دھیرے خطرناک شکل اختیار کر رہا ہے مگر دنیا بھر کی معیشتیں سب کچھ برداشت کر رہی ہیں۔ موزوں متعلقہ اقدامات کے ذریعے یہ ثابت کرنے یا دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا جس کے نتیجے میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا ہو، کساد بازاری کا بازار گرم ہو۔ گزشتہ برس مارچ اور اپریل کے دوران آبنائے ہرمز سے خام اور ریفائنڈ پروڈکٹس کی شکل میں یومیہ ایک کروڑ ۸۳ لاکھ بیرل تیل دنیا بھر کو پہنچایا جاتا رہا۔ متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب دو بڑی پائپ لائنوں کے ذریعے رسد کے خسارے کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم اِس کے باوجود ایک کروڑ ۳۰ لاکھ بیرل کا خسارہ پھر بھی برقرار ہے۔ خلیج کے خطے سے باہر رسد میں ۲۰ لاکھ بیرل یومیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ عالمی رسد میں مجموعی طور پر ایک کروڑ ۲۳ لاکھ بیرل یومیہ کا خسارہ پایا جارہا ہے جو مجموعی عالمی رسد کا ۱۰ فیصد ہے۔

تیل کے بحران پر قابو پانے کے لیے فاضل پیداوار آن لائن لائی جاسکتی ہے، خسارہ پورا کرنے کے لیے اسٹاک کو نیچے لایا جاسکتا ہے اور طلب کو دبانے کے لیے قیمتیں بلند ہوسکتی ہیں۔ آبنائے ہرمز کی بندش سے یہ پہلا آپشن زیادہ کارگر نہیں رہا۔ سعودی عرب اور امارات کی سرپلس صلاحیت، جو ایک زمانے سے مارکیٹ کے لیے مرکزی بفر کا کردار ادا کرتا آئی ہے، آبنائے ہرمز کی بندش کی پشت پر موجود ہے۔ امریکا میں انتہائی خام نوعیت کا تیل عام طور پر ایسی صورتِ حال میں خرابی کو کنٹرول کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ امریکی تیل کو زیادہ تیزی سے متحرک نہیں کیا جاسکتا۔ اِس کام میں امریکا کو ۳ سے ۶ ماہ لگ سکتے ہیں اور یہ سوال بھی ہے کہ کیا امریکا یومیہ ۳ لاکھ تا ۷ لاکھ بیرل کا خسارہ پورا کرسکے گا۔ امریکا میں پیداواری مشینری، پائپ لائن، ذخیرہ کاری کی تنصیبات اور برآمدات کے ٹرمنل اپنی سکت کی مکمل حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اِس وقت امریکا عالمی منڈی کو اپنی موجودہ سکت سے بڑھ کر ایک آئل ٹینکر بھی فراہم نہیں کرسکتا۔ روس تھوڑی سی کوشش سے مزید ۳ لاکھ بیرل یومیہ عالمی منڈی کو فراہم کرسکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ روس میں تیل کی تنصیبات پر یوکرین کے حملے ہوتے رہے ہیں۔ ایسے میں روس کے لیے موجودہ پیداواری صلاحیت کو برقرار رکھنا بھی انتہائی دشوار ثابت ہو رہا ہے۔

تیل کے بحران کو قابو میں رکھنے کے لیے کی جانے والی ہر ایڈجسٹمنٹ بنیادی طور پر اسٹاک کے صَرف یا پھر طلب کی کٹوتی کی شکل میں ہونی چاہیے۔ اِن میں سے کسی بھی آپشن کی پیمائش آسان نہیں۔ برآمدی ٹرمنلز، ٹینکرز اور ریفائنریز میں موجود خام تیل کی پیمائش بہت آسان ہے تاہم پٹرول، ڈیزل، کیروسین (جیٹ فیول) کی شکل میں ریفائنڈ پروڈکٹس کے اسٹاک کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ سب کچھ لاکھوں سپلائرز اور کنزیومرز کے پاس ہے۔

طلب کی پیمائش براہِ راست نہیں ہوتی۔ یہ بالعموم پیداوار، تجارت اور ذخیرہ کاری کے اعداد و شمار کے ذریعے ناپی جاتی ہے۔ بہرکیف، اِتنا تو واضح ہے کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور گھٹتی ہوئی رسد نے صَرف کو بہت حد تک گھٹا دیا ہے۔ ایک طرف تو خام تیل مہنگا ہے اور دوسری طرف تیار مصنوعات بھی مہنگی ہوگئی ہیں۔ مغربی دنیا نے تیل کی فراہمی مشکل بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے جس کے نتیجے میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ڈیزل اور جیٹ فیول دنیا بھر مہنگا

ہوا ہے۔ ایشیا میں تیل کے سب سے بڑے سیلنگ پوائنٹ سنگاپور میں اب ڈیزل اور جیٹ فیول کی لاگت دُگنی ہوچکی ہے۔ یورپ میں معاملہ اِس سے بھی زیادہ کا ہے۔ جب سے ایران کے خلاف جنگ شروع ہوئی ہے، میانمار (برما) میں پٹرول کی قیمت دُگنی ہوچکی ہے۔ پاکستان میں کم و بیش ۵۲ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ فلپائن میں پٹرول ۵۰ فیصد اور نیپال میں ۴۰ فیصد مہنگا ہوا ہے۔

اپریل میں تیل کی طلب ۳۰ لاکھ تا ۵۰ لاکھ بیرل یومیہ تک رہی جبکہ ماہرین نے اِس سے کہیں زیادہ کی پیش گوئی کی تھی۔ اِس میں سے ۱۰ تا ۱۵؍فیصد کا بوجھ مشرقِ وسطیٰ برداشت کرتا ہے۔ جنگ نے اس خطے میں معاشی سرگرمیوں کا حجم گھٹا دیا ہے جبکہ ایئر ٹریفک میں دو تہائی تک کی کمی واقع ہوئی ہے۔ ایشیا میں پٹروکیمیکل انڈسٹری بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے۔ پلاسٹک کی تیاری میں استعمال ہونے والی آئل پروڈکٹ Naphtha خصوصی طور پر خلیج کے خطے سے آتی ہے اور اِس کی رسد بھی پریشان کن حد تک گھٹ گئی ہے۔ اِس وقت ایشیائی ممالک اپنی ضرورت کا ۶۷ تا ۷۵ فیصد فیول حاصل کر پارہے ہیں۔ ایشیا میں تیل سے چلنے والے بجلی گھر اور صنعتی پلانٹ اپنی پوری استعداد کے مطابق کام نہیں کر پارہے۔ پلاسٹک کی پیداوار میں بھی خسارے کا سامنا ہے۔ مشرقی افریقا کا انحصار بہت حد تک خلیج فارس کے خطے سے منگوائے جانے والے ڈیزل، پٹرول اور مٹی کے تیل پر ہے۔ مشرقی یورپ میں بھی پٹرول، ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قلت واضح طور پر محسوس کی جارہی ہے۔

اگر دو ماہ کے دوران عالمی طلب میں کم و بیش ۴۰ لاکھ بیرل یومیہ کی کمی واقع ہوئی ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی ماندہ اسٹاکس ۸۰ لاکھ بیرل یومیہ کی شرح سے صَرف ہورہے ہیں۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ جب ایران جنگ شروع ہوئی تب اچھا خاصا تیل ٹینکرز کی شکل میں سمندروں میں تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بحران بہت تیزی سے انتہائی خطرناک شکل اختیار کرتا۔

خلیج کے تیل برآمد کرنے والے ممالک نے بحران کے ابھرنے کے آثار دیکھتے ہوئے ہفتوں پہلے ہی برآمدات کو کنٹرول کرنا شروع کردیا تھا۔ مغرب کی اقتصادی پابندیوں کے باعث اچھا خاصا ایرانی اور روسی تیل ٹینکرز میں اٹکا ہوا تھا۔ مارگن اسٹینلے نے بتایا کہ مارچ کے اوائل میں ٹینکرز کے ذریعے سمندروں میں محوِ سفر تیل نے ۳۰ لاکھ بیرول یومیہ تک کا بہترین بفر فراہم کیا۔ خیر، یہ صورتِ حال زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس وقت سمندروں میں معمول سے بہت کم ریفائنڈ آئل پروڈکٹس ہیں۔ سمندروں سے نکالا جانے والے خام تیل کی برآمد زیادہ متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ہاں، یہ معاملہ بھی اِس لیے آسان نہیں کہ امریکا، افریقا یا کہیں اور کے سپلائرز کے لیے طویل سفر بہت مشکل ہے۔

صاحبِ ثروت ممالک نے اپنے اسٹریٹجک ریزروز کو ریلیز کرکے سپلائی بڑھائی ہے اور اِس کے نتیجے میں بحران کو ٹالنے میں بہت حد تک مدد ملی ہے۔ ۱۱؍مارچ کو انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے ۳۲؍ارکان نے ۴۰ کروڑ بیرل خام تیل فروخت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ اس ادارے کی حدود میں اپنی نوعیت کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ ۱۰؍کروڑ بیرل تیل مارکیٹس میں پہنچ چکا ہے۔ مئی اور جون میں مزید ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ بیرل تیل مارکیٹ میں پہنچے گا۔ جس وقت ۴۰ کروڑ بیرل خام تیل فروخت کرنے کا اعلان کیا گیا تھا تب انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے بیشتر ارکان کا خیال تھا کہ ایران آبنائے ہرمز کو زیادہ دیر تک بند نہیں رکھے گا۔ اب جبکہ خلیجی ممالک کے تیل کی فراہمی میں طویل المیعاد خلل واقع ہوسکتا ہے، طاقتور ممالک نہیں چاہیں گے کہ اُن کے اسٹریٹجک ذخائر ختم ہوجائیں۔

رسد میں کم و بیش ۵۰ لاکھ بیرول یومیہ کا خسارہ تجارتی اسٹاکس سے پورا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تیل کی ایک فرم گنوور کے فریڈرک لیزرے کا کہنا ہے کہ اپریل میں جو کچھ بھی عالمی منڈی کو درکار تھا، اُس میں سے نصف فنشڈ پروڈکٹس کی شکل میں تھا۔ کووِڈ کے بعد دنیا بھر میں تیل کی طلب میں اضافہ ہوا تاہم یہ اضافہ بھی ایک ماہ تک ۲۵ لاکھ بیرل یومیہ سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ اگر آبنائے ہرمز کی بندش برقرار رہی تو طلب کو پورا کرنے کے لیے ایک طرف تو سمندر میں موجود تیل کو بروئے کار لایا جائے گا اور اسٹریٹجک ریزروز کو بھی مارکیٹ میں لایا جائے گا مگر اِس متبادل کے ڈگمگانے پر کمرشل انوینٹریز کو بروئے کار لاتے ہوئے ۶۰ لاکھ تا ۸۰ لاکھ بیرل یومیہ کی رسد زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھی جاسکے گی۔ کنسلٹنسی فرم انرجی اسپیکٹس کی امرتا سین کا کہنا ہے کہ رسد برقرار رکھنے کے لیے اسٹاکس پر زیادہ دیر تک بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کوئی اچھا متبادل نہیں۔ جو کچھ اِس وقت سفارتی اور اسٹریٹجک سطح پر ہو رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بیشتر خطوں میں ۴ سے ۸ ہفتوں کے دوران پٹرولیم مصنوعات کی قلت خطرناک حد تک شدت اختیار کرے گی۔ اگر رسد میں واقع ہونے والے خسارے کو قابو میں رکھنا ہے تو لازم ہے کہ طلب میں کمی واقع ہو۔ جب طلب بڑھے گی تو قیمت بھی بڑھے گی اور اِس کے نتیجے میں طلب گھٹے گی بھی۔ دنیا بھر میں بدحواسی کے آثار بھی ہیں۔ چند ہفتے قبل ڈیزل کارگو ۳۰۰ ڈالر فی بیرل کے نرخ پر فروخت ہورہا تھا۔ اب یہ قیمت ۶۰۰ ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی ہے۔

تیل کا بحران عالمگیر نوعیت کا ہے اور مختلف خطّوں پر اِس کے شدید اثرات مرتب ہوکر رہیں گے۔ فیول انوینٹریز ختم ہونے کو ہیں۔ ترسیل کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کا سامنا کرنے کے لیے پروڈکشن گھٹائی گئی ہے۔ بہت سے خطوں اور ملکوں میں فلنگ اسٹیشنز پر گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی ایک ایک کلومیٹر لمبی قطاریں عام ہیں۔ کینیا اور موزمبیق جیسے افریقی ممالک تو ایک ایک جہاز کی آمد کی بنیاد پر جی رہے ہیں۔ اگر رسد رک جائے تو وہ دو تین دن بھی اپنے معیشتی وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ چین کے پاس آئل پروڈکٹس کے غیر معمولی ذخائر ہیں۔ ایشیا کے بیشتر ممالک کا حال رفتہ رفتہ ابتر ہوتا جارہا ہے۔ ایشیائی ممالک میں ذخیرہ شدہ تیل میں ۱۳؍فیصد کمی واقع ہوئی ہے جس کے بعد اب یہ ۵۴ کروڑ ۵۰ لاکھ بیرل کی سطح پر آگئے ہیں۔ یہ بات سیٹلائٹس کے ذریعے نگرانی کرنے والے ادارے Kayrros نے بتائی ہے۔ گلف کروڈ کے نام سے معروف فیڈ اسٹاک بھی غائب ہوچکا ہے جس کے نتیجے میں پیداوار میں ۳۵ لاکھ بیرل یومیہ یا ۱۲؍فیصد کمی واقع ہوچکی ہے۔ ڈیٹا فرم اسپارٹا کموڈٹیز کے نیل کراسبی کا کہنا ہے کہ آبنائے ہرمز کے بند رہنے کی صورت میں جون تک یہ بحران دُگنا ہوسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں ایندھن کی قلت شدت اختیار کرتی جائے گی۔ انڈونیشیا، پاکستان اور فلپائن غیر معمولی قلت کا شکار ہونے کی منزل سے تقریباً ۶ ہفتوں کی دوری پر ہیں۔ آسٹریلیا بھی ڈیزل اور جیٹ فیول کی قلت سے دوچار ہونے کی منزل تک پہنچ چکا ہے۔ جنوبی امریکا تا حال بہت حد تک محفوظ ہے کیونکہ وہاں تیل بہت بڑے پیمانے پر نکلتا ہے اور برآمد بھی کیا جاتا ہے۔ ہاں، ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جنوبی امریکا کے ممالک کے پاس تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی کمی ہے۔ یہ ممالک جتنا تیل استعمال کرتے ہیں، اُتنا صاف نہیں کرپاتے۔ اِس کے لیے اُنہیں خلیجِ میکسیکو سے درآمدات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ڈیٹا فرم کپلر کے مچل بروہارڈ کا کہنا ہے کہ ایشیا کے لیے روانہ کیا جانے والا تیل بالآخر یورپ پہنچ سکتا ہے کیونکہ یورپ اُس کے لیے زیادہ قیمت ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوگا۔ جنوبی امریکا اور مغربی

افریقا سے تیل کی وسیع برآمدات کا حامل ہونے کی بدولت وہ ایندھن سے محروم نہیں ہوگا تاہم اُس کے لیے ریفائننگ ایک بنیادی مسئلہ ہے کیونکہ سارا زور پٹرول تیار کرنے پر ہے، ڈیزل تیار کرنے پر نہیں۔ ساتھ ہی کیروسین کی تیاری پر بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں روڈ ٹریفک کا مدار ڈیزل پر ہے۔ یہی سبب ہے کہ یورپ کو فیول کے معاملے میں درآمدات پر زیادہ انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یورپ کے لیے تیل کی مصنوعات کی فراہمی کا بڑا ذریعہ روس رہا ہے۔ خلیج فارس اور بھارت ۲۰۲۲ء کے بعد ایک طرف ہٹ گئے۔ اب یہ تمام ذرائع بھی خشک ہو چکے ہیں۔

اپنے معاملات درست کرنے کے لیے یورپی ریفائنرز نے زیادہ خام مال کو کیروسین میں تبدیل کیا ہے اور ایسا دیگر ایندھن کی قیمت پر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف خلیج میکسیکو سے ڈیزل زیادہ درآمد کیا جاتا رہا ہے۔ امریکا کے مشرقی ساحلوں سے بھی درآمدات رہی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ۵ ہفتوں میں وہاں اسٹاک ۱۱ فیصد تک گرے ہیں۔

تیل کے بحران پر قابو پانے کا کوئی بھی میکنزم زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو پا رہا۔ ڈیزل کے اسٹریٹجک ذخائر جس قدر گھٹتے جائیں گے، ٹرمپ انتظامیہ پر برآمدات گھٹانے یا معطل کرنے کے لیے دباؤ اُسی قدر بڑھتا جائے گا۔ یورپی ریفائنریز کو بالآخر ڈیزل کی پیداوار بحال کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اِس کے نتیجے میں کیروسین کی پیداوار مرجھا سکتی ہے۔ انٹرنیشنل انرجی ایجنسی نے خبردار کیا کہ اگر یورپ نے جون تک خلیجی ریاستوں سے آنے والی تیل کی درآمدات کے خسارے کو محض نصف کی حد تک پورا کیا تو اُسے جیٹ فیول کی قلت کا سامنا ہو سکتا ہے۔ یورپی ایئر لائنز پہلے ہی پروازوں میں کٹوتی کر رہی ہیں اور فیول سرچارج بھی وصول کر رہی ہیں۔ اگر یورپی حکومتوں نے سبسڈیز اور ٹیکس کٹوتیوں کے ذریعے پٹرولیم مصنوعات کا صَرف بڑھانے کی کوشش کی بھی تو اُس کے ڈیزل اور جیٹ فیول کے ذخائر زیادہ تیزی سے ختم ہوں گے۔ یورپی حکومتیں انتہائی نوعیت کے وقت کو ٹالنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں اور اِس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بحران کو صرف ٹالا جا رہا ہے، ختم نہیں کیا جا رہا۔ جب کبھی یہ بحران نمودار ہوگا تب اُس پر قابو پانا انتہائی دشوار ہوگا۔

توانائی کے ابھرتے ہوئے بحران سے تو خود امریکا بھی محفوظ نہیں۔ وہاں پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں بڑھی ہیں۔ مارچ میں امریکا میں پٹرول کا نرخ ۳ ڈالر فی گیلن تھا۔ اب وہاں پٹرول ۴ ڈالر ۲۰ سینٹ فی گیلن کے نرخ پر فروخت ہو رہا ہے۔ امریکا میں آبادی کا ارتکاز ملک کے مشرقی ساحلوں پر ہے۔ مشرقی ساحل کے شہروں اور قصبوں کی کھپت کی پٹرولیم مصنوعات خلیج میکسیکو سے زیادہ آتی ہیں۔ اِن علاقوں میں تیل صاف کرنے کی گنجائش زیادہ نہیں۔ امریکا کے مغربی ساحلوں کے لیے تیل بنیادی طور پر خلیج میکسیکو سے پائپ لائن کے ذریعے آتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کے دیگر علاقوں سے بھی تیل کی درآمدات آتی ہیں۔ امریکا کے بیشتر وسطی علاقے توانائی کے بحران کے حوالے سے بہتر حالت میں ہیں۔ امریکا میں موسمِ گرما کا ڈرائیونگ سیزن شروع ہونے والا ہے۔ ایسے میں فیول کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اگر آبنائے ہرمز مزید تین چار ہفتے بند رہی تو صورتِ حال بہت نازک ہو جائے گی۔ ایسے میں امریکا بھر میں پٹرول کی قیمت ۵ ڈالر فی گیلن تک جا سکتی ہے۔ کووڈ کے بعد کی صورتِ حال میں امریکا کو پٹرول کے جس بحران کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس نے ڈرائیونگ سیزن میں لوگوں کو کم فیول استعمال کرنے پر مجبور کیا تھا اور اِس کے نتیجے میں صدر کی حیثیت سے جو بائیڈن کی مقبولیت کا گراف بہت نیچے آ گیا تھا۔

اگر سفارتی سطح پر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو آئل شاک کے اثرات بہت جلد واضح ہو جائیں گے۔ مسٹر کراسبی کا کہنا ہے کہ کچھ نہ کچھ ٹوٹے گا۔ پہلے تو ریفائنڈ پروڈکٹس کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھیں گی۔ ان پروڈکٹس کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اِس کے نتیجے میں خام تیل کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اِس کا سبب یہ ہوگا کہ تیل صاف کرنے کے کارخانے صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیل صاف کرنا چاہیں گے اور یوں خام تیل کی قیمت بڑھے گی۔

دنیا بھر میں حکومتیں تیل کا بحران ٹالنے یا اُس کا حجم کم رکھنے کے لیے انتظامی نوعیت کے بڑے اقدامات میں مصروف ہیں۔ پٹرولیم مصنوعات کی کھپت کم کرنے کے لیے ورک فراہم ہوم کی پالیسی کو زیادہ تیزی سے اپنایا جا رہا ہے۔ اضافی تعطیلات بھی دی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پبلک ٹرانسپورٹیشن سسٹم بہتر بنانے پر توجہ دی جا رہی ہے۔ ملائیشیا، فلپائن، تھائی لینڈ اور دیگر بہت سے ملکوں میں سرکاری ملازمین سے کہا گیا ہے کہ وہ دفتر آنے کی زحمت گوارا نہ کریں، گھر سے کام کریں۔ سری لنکا نے چار دن کام کرنے کا ہفتہ متعارف کرایا ہے۔ پاکستان میں بھی دکانیں اور ریسٹورنٹس بند کرنے کے نئے اوقات نافذ کیے جا رہے ہیں۔

بہت سے ممالک تیل کی برآمد گھٹا رہے ہیں تاکہ اندرونِ ملک مسائل پیدا نہ ہوں۔ چین کیروسین پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اُس نے کیروسین کی برآمد پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے۔ کیروسین پیدا کرنے والے دوسرے بڑے ملک جنوبی کوریا نے بھی ایسا ہی کیا ہے جبکہ بھارت نے کیروسین کی برآمد کی حوصلہ شکنی کے لیے ٹیکس بڑھا دیے ہیں۔ ایسی پابندیاں دیگر بہت سے مقامات پر مسائل پیدا کر رہی ہیں۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اپنی ضرورت کا جیٹ فیول چین اور جنوبی کوریا سے حاصل کرتے ہیں۔

توانائی کے متبادل ذرائع کو پروان چڑھانے پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ ارجنٹائن میں ایتھانول کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ ایتھانول کو پٹرول میں ملا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا نے ایتھانول اور ڈیزل ملا کر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

بہت سے ملکوں نے فیول اور دیگر آئل پروڈکٹس کی خریداری کی حد مقرر کر کے بھی بحران پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ موٹر سائیکل والوں کے لیے فیول کو یومیہ ڈیڑھ یا دو لیٹر تک محدود کیا جا رہا ہے۔ کمبوڈیا میں ایک تہائی فلنگ اسٹیشن بند کر دیے گئے ہیں۔

اس قسم کے تمام اقدامات فی الحال پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں کیے گئے ہیں۔ یورپ میں بھی اب چند حکومتوں نے انتہائی نوعیت کے اقدامات کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ فیول کی تقسیم کا معاملہ کنٹرول کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بحرانی کیفیت سے بہ طریقِ احسن نپٹنے کے لیے کہیں کہیں مسابقت کے قوانین معطل کرنے پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔

یہ تمام اقدامات غیر ضروری سے محسوس ہوں گے اگر امریکا اور ایران کے درمیان کوئی معاہدہ طے پا گیا اور آبنائے ہرمز کھول دی گئی۔ خیر، ایسی صورت میں بھی آئل مارکیٹ کو بحال ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ آبنائے ہرمز کو سب سے پہلے تو بارودی سرنگوں سے پاک کرنا ہوگا۔ انشورنس اور شپنگ فرمز کے اعتماد کی بحالی میں بھی وقت لگے گا اور اس کے بعد آبنائے ہرمز میں ٹریفک معمول پر آئے گا۔ اٹکے ہوئے جہازوں کو خلیجی ریاستوں کا رخ کرنا ہوگا۔ وہاں سے وہ تیل لے کر ریفائنریز کا رخ کریں گے۔ اس عبوری مدت میں بھی ترقی یافتہ ممالک اسٹریٹجک ذخائر کے ذریعے بحران کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ ہاں، غریب اور ترقی پذیر ممالک شدید مشکلات میں گھرے رہیں گے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۲ \\\\\\

# پاکستانی جین زی: ذہنی دباؤ کا بڑھتا بحران

سید فراست شاہ

پاکستان کی آبادی میں نوجوانوں کے بڑے تناسب کو اس ملک کی ایک اہم طاقت اور برتری کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔ جہاں بہت سے ترقی یافتہ ممالک نوجوان آبادی کی کمی کا رونا روتے نظر آتے ہیں، پاکستان کی یہ جواں سال ملت ملک کے روشن مستقبل کے لیے ایک اچھی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

چند روز قبل اسلام آباد میں منعقد ہونے والے ایک مذاکرے میں ایک نوجوان لڑکی نے سوال کیا ''کیا اس ملک میں ہمارے لیے کوئی امید ہے''۔ راقم نے جواب میں کہا ''دراصل آپ اس قوم کی امید ہیں''۔ اس موقع پر سامعین میں موجود نوجوانوں نے تالیاں بجا کر اس جملے کو سراہا۔ راقم جین زی کی بہت سی امتیازی خصوصیات کا معترف ہے، ان سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ان کی افضلیت کا ذکر بارہا اپنی تحریر و تقریر میں کرتا رہا ہے۔

جب ہمارے لیے یہ نسل اتنی اہم ہے تو اس کی دیکھ بھال اور اس کی اٹھان پر خصوصی توجہ لازمی ہے۔ تاہم، اس کے لیے انہیں اور ان کے مسائل کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہمیں پہلے اپنے قائم شدہ تصورات کو چھوڑنا ہوگا۔ ان سے تبادلۂ خیال کے نئے انداز اختیار کرنے ہوں گے۔ اسی سوچ کے ساتھ، پچھلے رمضان میں راہ ٹی وی کے تعاون سے، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں راقم نے جین زی کے مختلف نمائندوں کے ہمراہ قرآن فہمی کے ۳۰ پروگرام ریکارڈ کروائے۔ ریکارڈنگ کے دوران ان لڑکے لڑکیوں کے تیکھے سوالات جہاں راقم کے لیے نئی معلومات کا باعث بنے، وہاں یہ خیال بھی آتا رہا کہ ہم ان کے اندازِ فکر سے کتنے ناواقف ہیں۔

پاکستان میں نوجوان نسل، خصوصاً موجودہ ''جنریشن زی'' یا نئی ڈیجیٹل نسل، ایک ایسے دور سے گزر رہی ہے جہاں بظاہر سہولتیں بڑھ رہی ہیں لیکن اندرونی بے چینی، ذہنی دباؤ، خوف، عدم تحفظ اور ہراسانی کے مسائل بھی شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں پنجاب کی مفت نفسیاتی معاونت کی سہولت اور ہنگامی خدمات سے متعلق سامنے آنے والی اطلاعات نے اس موضوع کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی نوجوانوں میں ذہنی مسائل اور ہراسانی کے واقعات بڑھ رہے ہیں یا صرف ان کی رپورٹنگ زیادہ مؤثر اور نمایاں ہوگئی ہے؟ حقیقت شاید ان دونوں عوامل کا مجموعہ ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کی نئی نسل ایک غیر معمولی نفسیاتی اور سماجی دباؤ کے ماحول میں پروان چڑھ رہی ہے، جو شاید کئی زاویوں سے دیگر ممالک میں موجود جین زی کے مسائل سے زیادہ شدید ہے۔

چند برس پہلے تک ہمارے معاشرے میں ذہنی دباؤ، خوف، افسردگی یا ہراسانی جیسے معاملات پر گفتگو کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے کسی قسم کی ہراسانی یا ذہنی اذیت کا ذکر کرنا اکثر خاندان کی ''بدنامی'' تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بے شمار واقعات خاموشی میں دفن ہو جاتے تھے۔ اب حالات کسی حد تک بدل رہے ہیں۔ نوجوان نسل اپنے مسائل بیان کرنے لگی ہے، مدد لینے میں نسبتاً کم جھجک محسوس کرتی ہے اور جدید ذرائع ابلاغ نے شکایات درج کروانے کو بھی آسان بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے کے مقابلے میں رپورٹ ہونے والے واقعات کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔

لیکن اگر ہم صرف رپورٹنگ میں اضافے کو اصل وجہ قرار دے دیں تو یہ حقیقت سے فرار ہوگا۔ موجودہ دور میں نوجوانوں کو جن حالات کا سامنا ہے وہ ماضی کی نسلوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دباؤ سے بھرپور ہیں۔ آج کا نوجوان بیک وقت دو متضاد دنیاؤں میں زندہ ہے۔ ایک طرف روایتی خاندانی اور سماجی اقدار ہیں جہاں ابھی بھی سخت نگرانی، توقعات اور سماجی دباؤ موجود ہے، جبکہ دوسری طرف عالمی ڈیجیٹل دنیا ہے جہاں ہر لمحہ نئی خواہشات، نئی تمنائیں اور مصنوعی کامیابیوں کے نمونے نوجوانوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس تصادم نے نوجوان ذہنوں کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔

سماجی ذرائع ابلاغ نے زندگی کو آسان بنانے کے ساتھ ساتھ انسان کو مسلسل تقابل کے عذاب میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ نوجوان ہر وقت دوسروں کی بظاہر خوشحال زندگی، مہنگی اشیاء، بیرونی سیاحت، خوبصورتی اور مصنوعی کامیابیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں احساسِ محرومی بڑھتا ہے۔ ایک متوسط یا غریب گھرانے کا نوجوان جب اپنی حقیقت کا موازنہ ان چمکتی ہوئی تصویروں سے کرتا ہے تو اس کے اندر ناکامی، بے چینی اور کمتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ اہم ہوگا کہ ہم اپنے نوجوانوں میں خود اعتمادی اور اسلامی تشخص کو مضبوط کرنے کے بہترین طریقے اور ذرائع تلاش کریں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آن لائن ہراسانی ایک سنگین سماجی مسئلہ بن چکی ہے۔ پہلے ہراسانی محدود دائرے تک رہتی تھی، لیکن اب یہ ہر وقت موبائل فون کے ذریعے انسان کے ساتھ جڑی رہتی ہے۔ جعلی تصاویر، بلیک میلنگ، خفیہ معلومات کی تشہیر، جعلی شناختی اکاؤنٹ، دھمکیاں اور کردار کشی جیسے جرائم نوجوانوں، خصوصاً لڑکیوں، کے لیے خوف کا مستقل سبب بنتے جا رہے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی نئی ٹیکنالوجی نے اس خطرے میں مزید اضافہ کر دیا ہے، جہاں جعلی ویڈیوز اور تصاویر کے ذریعے لوگوں کی عزت اور ذہنی سکون کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے معاشی حالات بھی نوجوان نسل کی ذہنی کیفیت پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، غیر یقینی سیاسی صورتِ حال اور مستقبل کے حوالے سے مایوسی نوجوانوں کے اندر شدید اضطراب پیدا کر رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود روزگار نہ ملنا، تعلیم تک رسائی ہی نہ ملنا، کم آمدنی، بیرون ملک جانے کی تمنا اور بے بسی، غرض یہ معاشی عدم استحکام نوجوانوں کو احساسِ ناکامی میں مبتلا کر رہا ہے۔ ماضی میں شاید وسائل کم تھے مگر امید زیادہ تھی، جبکہ آج معلومات اور خواہشات زیادہ ہیں لیکن امید کم ہوتی جا رہی ہے۔

تعلیمی نظام بھی نوجوانوں کے لیے ایک مستقل ذہنی دباؤ کا ذریعہ بن چکا ہے۔ نمبروں کی دوڑ، مقابلے کی فضا، والدین کی بلند توقعات اور کامیابی کے محدود پیمانے نوجوانوں کو مسلسل ذہنی تھکن میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں بچے کی شخصیت، صلاحیت یا ذہنی سکون سے زیادہ اس کے امتحانی نتائج کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نوجوان اندر ہی اندر ٹوٹتے رہتے ہیں مگر بظاہر معمول کی زندگی گزارتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماں باپ کا اپنے بچوں کے درمیان صرف امتحانی نتائج کی بنیاد پر تقابل کرنا نہایت تباہ کن ہوسکتا ہے۔

خاندانی نظام میں تبدیلی بھی ایک اہم عنصر ہے۔ پہلے مشترکہ خاندانوں میں انسان کو جذباتی سہارا مل جاتا تھا۔ بزرگوں کی موجودگی، رشتوں کی قربت اور سماجی تعلقات انسان کو تنہائی سے بچاتے تھے۔ اب شہری زندگی میں تنہائی بڑھتی جا رہی ہے۔ نوجوان بظاہر ہزاروں افراد سے آن لائن

باقی صفحہ نمبر ۶

# نئے ورک کلچر کی تلاش

**Hugh Cameron**

ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جس میں سہولتیں ہی سہولتیں ہیں اور بحران ہی بحران ہیں۔ قدم قدم پر کچھ نہ کچھ نیا ہے۔ ایک طرف انسان کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی کی شکل میں سہولتیں ہیں اور کام آسان ہوتا جارہا ہے جبکہ دوسری طرف مشکلات ہیں کہ انسان کی جان نہیں چھوڑ رہیں۔ جن سہولتوں کے خواب دیکھے جاتے تھے، وہ اب زندگی کا حصہ ہیں مگر ستم یہ ہے کہ زندگی میں جتنی آسانی ہے، اُتنی ہی یا پھر اُس سے زیادہ الجھنیں ہیں۔ ایسا اِس لیے ہے کہ کام میں مدد دینے والے عوامل جس قدر بڑھ رہے ہیں، کام اُسی قدر پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ ایسا اِس لیے ہے کہ ہر انسان پر ایک انوکھا بوجھ بڑھتا ہی جارہا ہے، وقت کی بڑھتی ہوئی کمی کا بوجھ۔

وقت ہر انسان کے لیے گھٹ رہا ہے۔ مقابلہ بہت زیادہ ہے۔ ہر شعبے میں مسابقت کی فضا اِتنی پیچیدہ ہوچکی ہے کہ انسان کے لیے ڈھنگ سے کچھ کرنا انتہائی دشوار ہوچکا ہے۔ وقت کی کمی کا احساس دن بہ دن توانا تر ہوتا جارہا ہے اور کیوں نہ ہو کہ وقت کی کمی واقعی اِس قدر واقع ہوچکی ہے کہ انسان کے لیے حواس برقرار رکھنا انتہائی دشوار ہوچکا ہے۔

انسان اگر وقت کے حوالے سے غیر معمولی ذہنی دباؤ کا شکار ہے تو بات کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ دنیا بھر میں لیبر مارکیٹ پوری شدت کے ساتھ ڈانوا ڈول ہے۔ ماحول پر غیر یقینیت چھائی ہوئی ہے۔ کسی کی بھی جاب کسی بھی وقت جاسکتی ہے کیونکہ مصنوعی ذہانت نے بہت سے شعبوں کی بساط لپیٹ دی ہے اور مزید بہت سے شعبوں کو بھی چلتا کرنے کی جستجو میں دکھائی دے رہی ہے۔ ایسی ملازمتیں اب برائے نام رہ گئی ہیں جن میں لوگوں کو تھوڑا سا زیادہ کام کرنے پر نوازا جاتا ہو۔ مقامِ کار کے اندر اور باہر مسابقت اِتنی زیادہ ہے کہ ہر انسان کسی بھی وقت کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایسے میں بیشتر انسان ڈھنگ سے سمجھ ہی نہیں پارہے کہ کریں تو کیا کریں۔ ایک طرف ملازمت کی غیر یقینیت بڑھ رہی ہے، دوسری طرف کام بڑھ رہا ہے یعنی انسان کو بیک وقت کئی کام کرنا پڑ رہے ہیں۔ ایسے میں ذہن پر دباؤ کا مرتب ہونا فطری امر ہے۔ ہر انسان کو روزانہ قدرت کی طرف سے چوبیس گھنٹے عنایت کیے جاتے ہیں مگر محسوس یہ ہورہا ہے کہ یہ چوبیس گھنٹے تو بہت کم ہیں۔ انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ماہرینِ نفسیات نے اب ایک خاص اصطلاح کا سہارا لیتے ہوئے مباحثے شروع کیے ہیں۔ جس انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے پاس وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ، اُسے time-poor کہا جاتا ہے۔ وقت بہت کم ہونے کی حالت کو time-poverty کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اِسے ''افلاسِ وقت'' کہا جانا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اِس سے چشم پوشی انسان کو مزید الجھنوں سے دوچار کرسکتی ہے۔ ہر انسان یہ محسوس کررہا ہے کہ اُسے کام بہت زیادہ کرنا ہے جبکہ اُس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اِس کم بلکہ کم سے کم ہوتے ہوئے وقت کو زیادہ سے زیادہ بار آور طریقے سے بروئے کار لانا ہر انسان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ زندگی کا معیار برقرار رکھنے اور بلند تر کرنے کے حوالے سے دباؤ اور بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ انسان کو بہت زیادہ کمانے کی صورت ہی میں معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوئی راہ سُوجھتی ہے۔ بہبودِ عامہ کی امریکی فرم Wondr Health نے ایک حالیہ سروے میں بتایا ہے کہ امریکی محنت کشوں کی اکثریت (۶۲ فیصد) آرام کا وہ وقت حاصل نہیں کرپاتی جو اُس کے لیے مختص ہے اور اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اُس پر اندرونی سطح کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ ایک تہائی امریکی ملازمین اور محنت کش ایسے بھی ہیں جو سالانہ تعطیلات سے بھی کماحقہ مستفید نہیں ہو پاتے۔ آجر اُنہیں ایسا کرنے ہی نہیں دیتے یا پھر ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اُن کے لیے تعطیلات پر جانا ممکن ہی نہیں رہتا۔

وَنڈر ہیلتھ کے چیف میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ٹم چرچ کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کو افلاسِ وقت کی کیفیت سے دوچار کرنے میں کسی اور کے مقابلے میں زیادہ اہم کردار خود اُس انسان کا ہوتا ہے۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے پر زیادہ یا خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے یعنی لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ اُن کی زندگی میں اِس وقت کون سی بات ہنگامہ برپا کیے ہوئے ہے، ہلچل مچارہی ہے۔ کام کا ماحول انسان کو بہت زیادہ ذہنی دباؤ سے دوچار کررہا ہے۔ آجر یعنی ملازمت دینے والوں اور اجیر یعنی ملازمین کو یکساں طور پر سوچنا چاہیے کہ کام کے ماحول میں پائے جانے والے ذہنی دباؤ کو کس طور کم کیا جائے۔

کام کے ماحول میں پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا حل پیش کرنے والی کمپنی One Mind at Work کے نائب صدر ڈیوڈ بیلارڈ کا کہنا ہے کہ آج کے بیشتر کاروباری اداروں میں کام کا مجموعی ماحول (ورک کلچر) ایسا ہے کہ لوگوں کے لیے ٹائم آف یعنی کام سے کچھ دیر الگ رہنے اور توانائی بحال کرنے کی گنجائش نہیں رکھی جاتی۔ آجر چاہتے ہیں کہ لوگ بس کام کرتے رہیں۔ معیار سے اُنہیں کچھ خاص غرض نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی ساتھ اِس بات کا اہتمام بھی نہیں کیا جاتا کہ جو زیادہ دلجمعی سے زیادہ کام کرے اُسے اضافی مشاہرہ دیا جائے۔ منصب کا دباؤ بھی انسان پر کم نہیں ہوتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسے ورک کلچر والے ادارے کسی بھی اجیر یعنی ملازمین کے ہمہ وقت خدمت کے لیے حاضر ہونے کی حالت کو اُس کے لیے ایک اعزاز کا درجہ دیتے ہیں مگر اضافی طور پر کچھ ادا نہیں کرتے۔ اس نوعیت کے ورک کلچر میں ملازمین چھٹی کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں کیونکہ اُنہیں یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں اُن کے خلاف کارروائی ہوسکتی ہے۔

کام کے دباؤ سے انسان کی فکری ساخت اور اعصابی نظام میں جو ٹوٹ پھوٹ واقع ہورہی ہے اُس کے حوالے سے دنیا بھر میں تحقیق کا بازار گرم ہے اور ماہرین تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں تاکہ عام آدمی معاشی سرگرمیوں کے بوجھ تلے دب کر نہ رہ جائے۔ جانز ہاپکنز اسکول آف پبلک ہیلتھ کے سینئر سائنسدان اور ملازمین کی بہبود سے متعلق امور کے ماہر ران گوٹزل نے ''نیوز ویک'' سے گفتگو میں بتایا کہ کام کی زیادتی افراد، کاروباری اداروں اور پورے معاشرے پر شدید منفی اثرات مرتب کررہی ہے۔

گوٹزل کہتے ہیں ''ہر انسان اِس کوشش میں دکھائی دیتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہے اور اِس کوشش میں وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جو کچھ وہ کررہا ہے، اُس کا کوئی مثبت نتیجہ بھی برآمد ہورہا ہے یا نہیں۔ زندگی کا معیار بلند کرنے کا معاملہ ایک طرف رہ گیا ہے۔ لوگ اِس حوالے سے سوچنے کو ترجیح نہیں دے رہے۔ جو کچھ معاشی سرگرمیوں کے نام کیا جارہا ہے، اُس سے زندگی کو وسیع تر مفہوم میں کامیابی حاصل ہو بھی رہی ہے یا نہیں، اس کے

بارے میں سوچنے سے گریز کا رجحان بھی اب عام ہے۔''

کام کی زیادتی اور وقت کی شدید قلت کے احساس نے ذہنی صحت کے حوالے سے انتہائی نوعیت کے چیلنج پہلے ہی کھڑے کر رکھے ہیں۔ آج بیشتر انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ذہن مستقل دباؤ کی زد میں رہتا ہے۔ اعصابی تھکن ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اِس کے نتیجے میں جسمانی صحت کا گراف گرتا چلا جاتا ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ وقت کی کمی کا احساس انسان کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ بہت سے بے روزگار افراد کو لاحق ذہنی الجھنوں سے کہیں زیادہ ذہنی الجھنیں اُنہیں لاحق ہیں جو دن رات کام کر رہے ہیں اور اِس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ملازمت ختم نہ ہو جائے، آمدنی کا گراف گر نہ جائے۔

بیشتر آجروں اور اُن کے لیے پالیسی تیار کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ اُنہیں اِس بات کی کوئی فکر ہی لاحق نہیں کہ جن لوگوں سے اُنہیں کام لینا ہے، اُن کی ذہنی صحت کا معیار بلند رکھنا لازم ہے کیونکہ ذہنی الجھنوں کے ساتھ کوئی بھی انسان اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، اپنی صلاحیت و سکت کو قابلِ رشک انداز سے بروئے کار نہیں لاسکتا۔ یہ بات اب بالکل واضح ہو چکی ہے کہ عہدِ حاضر کی متعدد پیچیدگیوں نے انسان کو انتہائی نوعیت کی پریشانیوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایسے میں ڈھنگ سے معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا بھی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہر انسان کو ایک طرف معاش کے لیے بہت کچھ کرنا پڑ رہا ہے اور دوسری طرف وہ گھر، خاندان اور احباب کے حلقوں میں بھی الجھا ہوا ہے۔ معاشرتی زندگی داؤ پر لگ چکی ہے۔ انسان مل پاتا ہے نہ ڈھنگ سے بات ہی کر پاتا ہے۔ ذاتی یا نجی نوعیت کے مسائل معاشی سرگرمیوں پر بھی بُری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز کی جارہی ہے کہ جب انفرادی سطح پر اعصابی تھکن پیدا ہوتی ہے، ذہن الجھتا ہے تب صرف انفرادی نوعیت کی خرابیاں ہی پیدا نہیں ہوتیں بلکہ وہ کاروباری اداروں کی مجموعی کارکردگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ملازمین کی بہبود سے متعلق امور کے ماہرین اور ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ جب ملازمین کو وقت کی شدید کمی کا احساس ہوتا ہے تب اُن کی ذاتی کارکردگی کا گراف گرتا ہے، غیر حاضر رہنے کا رجحان پنپتا ہے اور جو لوگ باقاعدگی سے ڈیوٹی دیتے رہتے ہیں، وہ بھی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ اگر کوئی شخص ڈیوٹی پر آتا رہے مگر پورے ہوش و حواس اور توانائی کے ساتھ کام کرنے کے قابل نہ ہو تو آجر یعنی ادارے کو اِس سے کیا فائدہ؟

اضطراب اور دباؤ سے نپٹنے کی امور کی ماہر اور کلینیکل سائیکولوجسٹ ڈاکٹر کلو کارمائیکل کہتی ہیں کہ جو ملازمین وقفے وقفے سے کام چھوڑ کر آرام نہیں کرتے، توانائی بحال نہیں کرتے، اُن پر ذہنی اور جسمانی تھکن طاری رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اُن کے لیے زیادہ اور اچھی طرح کام کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت اُن کے ساتھ ساتھ ادارے کی کارکردگی پر بھی شدید منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ مستقل کام کرتے رہنے سے ملازمین میں بدمزگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بدمزگی اُن کی صلاحیت کو دُھندلا دیتی ہے اور سکت بھی گھٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ٹم چرچ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ بالکل سادہ اور اخراجات بڑھانے والا ہے یعنی جب ملازمین بہت تھکے ہوئے ہوتے ہیں تب محض دفتر، دکان یا فیکٹری میں حاضر ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کارکردگی کیا ہے۔ شدید تھکن کی صورت میں تخلیقی جوہر اور کارکردگی دونوں کا گراف گرتا ہے اور ملازمین شدید ذہنی و جسمانی دباؤ کے نتیجے میں عمومی جسمانی صحت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ذہن چونکہ پورے جسم کا کنٹرول سینٹر ہے، اِس لیے جو کچھ بھی ذہن پر بیت رہی ہوتی ہے، وہ لازمی طور پر پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔

جب کسی بھی ادارے میں کام کرنے والوں کو مستقل کام کرنا پڑے اور آرام کے خاطر خواہ مواقع نہ ملیں تو وہ کہیں اور بہتر مواقع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بہبودِ عامہ کی ماہر ڈاکٹر سوزین بابالی کا کہنا ہے کہ کام سے ہونے والی تھکن (برن آؤٹ) کے کئی پہلو ہوتے ہیں تاہم عمومی سطح پر ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کام سے متعلق دباؤ کے سامنے ہدف پذیر رہنے اور توانائی بحال کرنے کی اہلیت سے محروم ہو جانے کی صورت میں انسان پر شدید ذہنی تھکن طاری ہوتی ہے، تخلیقی جوہر متاثر ہوتا ہے اور مزاج میں مایوسی در آتی ہے۔ ایسی کیفیت کے حامل افراد ادارے کے لیے زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتی، اُن کی کارکردگی کا گراف گرتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سوزین بابالی کا یہ بھی کہنا ہے کہ شدید ذہنی و جسمانی تھکن طاری ہونے پر انسان اُداس اور مایوس سا رہنے لگتا ہے اور اپنے معاشرتی ماحول میں بھی اجنبیت سی محسوس کرنے لگتا ہے گویا وہ کسی غلط جگہ پھنس گیا ہو۔

مونٹ کلیئر اسٹیٹ یونیورسٹی کی ماہر عمرانیات یاسمین بیسین کاسینو کا کہنا ہے کہ امریکا اِس وقت اوور ورک کلچر کے نرغے میں ہے یعنی لوگوں کو بہت زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ صورتِ حال انتہائی پریشان کن اور تشویشناک ہے۔ بے روزگاری کا گراف بلند ہو رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت اور دیگر ٹیکنالوجیز نے ہر طرح کی ملازمت کو غیر محفوظ بنا دیا ہے اور ورک کلچر نے معاملات کو مزید بگاڑا ہے۔ نئی ٹیکنالوجیز نے بیشتر ملازمین کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے اجیروں پر یہ ثابت کرتے رہیں کہ وہ ہر وقت کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ای میل اور ٹیکسٹ میسیج کا فوری جواب دینا، کالز اٹینڈ کرنا یا جوابی کالز کرنا لوازم میں سے ہے۔ اداروں سے بڑے پیمانے پر چھانٹی اور بڑھتی ہوئی معاشی غیر یقینیت نے ملازمت پیشہ افراد کے لیے سوہانِ روح ثابت ہونے والا ماحول کھڑا کیا ہے۔ ملازمت برقرار رکھنے کے لیے لوگ چھٹی والے دن بھی بلائے جانے پر کام کرتے ہیں اور ہر وقت رابطے میں رہتے ہیں۔

ایک بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ ہفتہ وار تعطیل سے بھی لوگ کما حقہٗ مستفید نہیں ہو پاتے۔ گھر میں بھی بہت سی ذمہ داریاں نبھانی ہوتی ہیں۔ معاشرتی سرگرمیاں بھی داؤ پر لگ جاتی ہیں۔ ہفتے میں چار یا پانچ دن شدید نوعیت کی معاشی سرگرمیوں میں الجھے رہنے پر گھریلو یا معاشرتی سطح پر بہت کچھ کیے جانے سے رہ جاتا ہے۔ ہفتہ وار تعطیل یا تعطیلات میں انسان اُس خسارے کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر کلو کارمائیکل کا کہنا ہے کہ اداروں کو اب اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ملازمین کو آرام کے لمحات دینے چاہئیں اور وہ بھی اِس طور کہ جب وہ کام پر واپس آئیں تو ''بے کیا کام'' اُن کا ''خیر مقدم'' نہ کر رہا ہو۔ اگر کوئی دو دن دفتر سے دور رہنے پر پیر کو بیسیوں ای میلز اور پیغامات کو منتظر پائے تو ڈھنگ سے کام کرنے کی گنجائش برائے نام ہی رہے گی۔

چند ایک ماہرین نے تو یہ بھی تجویز کیا ہے کہ ملازمین کو ڈھنگ سے کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ''مینٹل ہیلتھ ڈیز'' فراہم کیے جائیں یعنی ملازمین ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد پورا ایک ہفتہ گھر پر گزاریں، اہلِ خانہ کو بھی وقت دیں اور اپنے آپ کو بھی۔ ایسا کرنا اِس لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو ملازمین کو آرام ملے گا اور دوسری طرف وہ اپنی زندگی کے معاشرتی پہلو کو بھی زیادہ توانا رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

یسمین کاسینو کا کہنا ہے کہ ایسا ورک کلچر پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جس میں انسان کو آرام اور تفریح کا بھرپور

موقع ملے اور وہ اپنی توانائی بحال کر سکے۔ انسان کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اُس پر بیزاری سی چھانے لگتی ہے۔ ایسے میں وہ ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتا یعنی اپنی صلاحیت و سکت کو پوری طرح بروئے کار لاکر مطلوب نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی بھر کام کرنا پڑتا ہے، اِس لیے تفریح کے مواقع فراہم کرنے والا ورک کلچر پروان چڑھانا لازم ہے۔

بیسین کاسینو کا کہنا ہے کہ کاروباری اداروں کو بھی یہ بات سمجھنا ہوگی کہ آرام اور تفریح کے موزوں مواقع فراہم نہ کرکے وہ اپنی افرادی قوت میں سے بہترین لوگوں سے محروم ہونے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ جب ملازمین دیکھتے ہیں کہ اُن سے مسلسل کام لیا جارہا ہے اور آرام کرنے کا موقع نہ دینے کے ساتھ ساتھ قدر کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جارہا ہے تو وہ ایسی جگہ کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جہاں اُنہیں احترام ملے اور معقول معاوضہ بھی۔ اگر ملازمین کو ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع دیا جائے تو ایسا کرنا ملازمین کے ساتھ ساتھ خود کاروباری اداروں کے حق میں بھی تو جاتا ہے۔

دی ہارورڈ بزنس اسکول نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ مسلسل کام کرتے رہنے سے صحت پر شدید منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور پیشہ ورانہ مہارت کا گراف بھی گرتا ہے۔ ڈھائی لاکھ سے زائد امریکیوں کی طرزِ زندگی اور معمولات کا جائزہ لے کر ماہرین اِس نتیجے تک پہنچے کہ بے روزگاری بھی ذہن کو جھنجھوڑ دیتی ہے مگر اِس کے مقابلے میں کام کی زیادتی اور آرام کا موقع نہ ملنے سے انسان کو زیادہ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر انسان یہ محسوس کر رہا ہے کہ وقت کو پَر لگ گئے ہیں، وہ ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے۔ کام کا دباؤ بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ مسابقت بڑھ رہی ہے۔ ٹیکنالوجی نے ہر شعبے میں ملازمت کے مواقع گھٹادیے ہیں۔ حکومتیں اور کاروباری ادارے افلاس مٹانے کے لیے تو اربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں مگر ''افلاسِ وقت'' کو بہت حد تک نظرانداز کیا ہوا ہے۔ اس کیفیت نے معاملے کو مزید بگاڑ دیا ہے۔ وقت کی کمی کا مسئلہ صرف ملازمین یا محنت کشوں کے لیے نہیں ہے بلکہ آجروں کو بھی اس چیلنج کا سامنا ہے۔ مسابقت اُن کے لیے بھی بڑھ رہی ہے۔

ایک طرف تو معاشی جدوجہد ہے اور دوسری طرف وہ جدوجہد ہے جسے کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ خواتین گھروں میں غیر معمولی نوعیت کی مشقت کرتی ہیں۔ بچوں کو پالنا، کھانا پکانا، برتن اور کپڑے دھونا، کپڑے سکھانا، استری کرنا، بچوں کو یومیہ بنیاد پر اسکول بھیجنے کے لیے تیار کرنا اور دیگر بہت سے گھریلو کام خواتین کسی معاوضے کے بغیر کرتی ہیں۔ یہی کام جب ملازماؤں سے کرایا جاتا ہے تب اچھی خاصی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ خواتینِ خانہ اپنی غیر معمولی مشقت کے صلے سے محروم ہی رہتی ہیں۔

اِس وقت دنیا بھر میں ایسا ورک کلچر پنپ رہا ہے جس میں کسی بھی انسان کے افلاسِ وقت کو زیادہ اہمیت نہیں دی جارہی ہے اور سارا زور صرف اور صرف زیادہ سے زیادہ کام لینے پر ہے۔ بہتری اُسی وقت آسکتی ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ وقت کی کمی کا سامنا سبھی کو ہے اور یہ کہ اِس بحران کو حل کیے بغیر ڈھنگ سے کام نہیں کیا جاسکتا۔

کاروباری اداروں کو پالیسیوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں یقینی بنانا ہوں گی۔ انہیں ملازمین کی زندگی میں پائی جانے والی پیچیدگیوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی ترک کرنا ہوگی۔ یہ بہت حد تک اخلاقی معاملہ ہے۔ کاروباری اداروں کو اپنی سماجی ذمہ داری کا بھی احساس کرنا چاہیے۔ آجر اگر صرف کام لینے پر یقین رکھتا ہو اور اجیروں کو سراہنے، نوازنے سے گریز کرتا ہو تو کام ڈھنگ سے ہو ہی نہیں سکتا۔ معاملات میں لچک محض سہولت نہیں بلکہ مشترک قدر ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ کام کے اوقات معقول اور متوازن بنائے جائیں بلکہ انسانیت کا احترام بنیادی چیز ہے۔

دنیا بھر میں وقت کی قلت سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا گیا ہے کہ ہفتے میں چار دن کام لیا جائے۔ ہاں، ایسے ماحول میں فضول سرگرمیوں کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ملازمین ہفتے میں چار دن پوری لگن سے کام کریں تو زیادہ کام کرسکتے ہیں اور تھکن بھی سوار نہیں ہوگی۔ دنیا میں پایا جانے والا ورک کلچر کچھ اِس نوعیت کا ہوگیا ہے کہ دفاتر میں لوگ آدھا وقت فضول گفتگو میں ضائع کرتے ہیں۔ جو لوگ خود کام نہیں کرتے، وہ دوسروں کو بھی کام نہیں کرنے دیتے۔ ایسے میں ایک معقول حکمتِ عملی یہ ہوسکتی ہے کہ دفاتر اور دیگر کام کاج کے دیگر مقامات پر جہان بھر کے فضول معاملات پر بولنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ملازمین کو پوری توجہ کے ساتھ کام کرنے کی تحریک دی جائے اور ہفتے میں تین دن مکمل آرام کے دیے جائیں۔ بہت سے ممالک میں کام کے دوران فضول گفتگو کی گنجائش نہیں ہوتی اِس لیے لوگ کم وقت میں زیادہ کام کرتے ہیں۔ پاکستان جیسے معاشروں میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں جتنا کام کرتے ہیں، وہ محض دو گھنٹے میں بھی ہوسکتا ہے۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کام کے اوقات گھٹادیے جائیں اور کام کے ماحول کو غیر معمولی نظم وضبط کے تابع کردیا جائے؟

نئے، معقول اور متوازن ورک کلچر کو متعارف کرنے اور پروان چڑھانے کے لیے غیر معمولی تیاریوں کی ضرورت ہے۔ اِس بات کو زیادہ یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ کام کے اوقات میں صرف کام ہو، کسی بھی فضول سرگرمی میں حصہ لینے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ آجروں کے لیے لازم ہے کہ اجیر کو غلام نہ سمجھیں اور اجیر بھی کسی سہولت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ معقولیت کا تقاضا ہے کہ وقت کو بروئے کار لانے کے معاملے میں نظم وضبط مثالی نوعیت کا ہو، اُسے ضائع کرنے سے گریز کیا جائے۔

صلے کے بغیر کی جانے والی محنت کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ بچوں کی نگہداشت کے معاملے میں زرِاعانت دینے کی بھی ضرورت ہے۔ اِس صورت میں خواتینِ خانہ پر سے دباؤ گھٹایا جاسکتا ہے اور یوں گھر کا ماحول خوشگوار ہوسکتا ہے۔

افلاسِ وقت اور کام کے دباؤ سے نمٹنے کے لیے انفرادی سطح پر کی جانے والی کوششوں کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اگر انسان یہ ثابت کردے کہ وہ اپنے وقت کو بہت گراں قدر جانتا ہے تو دوسروں کو بھی تحریک ملتی ہے کہ وہ اپنے وقت کی قدر کریں اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے سے گریز کریں۔ خواہ مخواہ کی تیزی کسی کام کی نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات کی فضول تیزی ختم کرنی چاہیے۔ اگر کسی کو اپنی زندگی کا ڈھانچا بدلنا ہے تو لازم ہے کہ سوچ سمجھ کر حکمتِ عملی مرتب کی جائے۔ وقت کو ہر حال میں ضائع ہونے سے بچایا جائے اور کام بھی اُتنا ہی کیا جائے جو کارکردگی کے گراف پر منفی اثرات مرتب نہ کرتا ہو۔

بڑے شہروں میں لوگ اپنا اچھا خاصا وقت کام پر جانے اور گھر واپس آنے میں ضائع کرتے ہیں۔ اِس ضیاع کو روکنا اُن کے لیے بہت حد تک ناممکن ہوتا ہے۔ وقت کو غیر بارآور انداز سے صَرف کرنے کی مشق بھی ختم ہونی چاہیے۔ وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے نظام الاوقات کی پابندی کی ذہنیت اپنانا پڑتی ہے۔ کام کی زیادتی سے پیدا ہونے والی تھکن انسان کا وقت بھی ضائع کرتی ہے اور سکت بھی۔ اِس کے لیے منصوبہ سازی لازم ہے۔ فضول سرگرمیوں کو شناخت کرکے اُن سے بچنے کی بھرپور کوشش کی جانی چاہیے۔ پہلے سے وقت طے کیے بغیر کسی سے ملنا بھی ایسا معمول ہے جسے ترک کرنے کی ضرورت ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۶ \\\\\\

# تکنیکی تربیت، خطرے کی گھنٹی

**Cheon Hyeon-woo Welder**

دنیا عجیب موڑ پر کھڑی ہے۔ پیشہ ورانہ معاملات کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں۔ دنیا کو جن لوگوں کی ضرورت ہے، وہ کم ہیں اور جن شعبوں میں افرادی قوت پہلے ہی طلب سے بہت زیادہ ہے اُن میں مزید لوگ شامل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ سب کچھ عدم توجہ کا نتیجہ ہے۔

دنیا بھر میں معاشی امور کے ماہرین بہت سے نقائص کی نشاندہی کررہے ہیں مگر لوگ اِس طرف متوجہ نہیں ہو رہے۔ آجروں کا یہ حال ہے کہ اب تک بھیڑ چال پر یقین رکھے ہوئے ہیں۔ وہ جس شعبے میں بڑھوتری ہوتی ہوئی دیکھتے ہیں، اُسی کی طرف لپکتے ہیں اور متعلقہ معاملات کے بارے میں زیادہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ایسا بنیادی طور پر اِس لیے ہے کہ مثبت یا انقلابی سوچ اختیار کرنے سے واضح طور پر گریز کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے زمانے میں بھی آجر اور اجیر دونوں صدیوں پرانی سوچ کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں، وہ زمانے کے تقاضوں سے تعلق اور مطابقت نہیں رکھتا مگر پھر بھی وہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو زیادہ یا قابلِ قبول حد تک بدلنے کے لیے نہیں۔ اِس کا نتیجہ بھی صاف ہے۔ دنیا بھر میں کروڑ افراد کاروبار اور ہنرمندی کی سطح پر ناکامی سے دوچار ہیں۔

پیرس اسکول آف اکنامکس میں ''ٹِلٹیڈ اِکوئٹی'' نامی کتاب کے اجرا کے موقع پر مصنف نے کچھ گفتگو کی جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ کام کے معاملے میں بھی کشش اور رنگینی چاہتے ہیں۔ جن شعبوں میں محنت زیادہ اور تھوڑا رُوکھا پن بھی ہے، اُن سے واضح طور پر گریز کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جن شعبوں میں رنگینی نہ ہو اور انسان کو واضح رُوکھا پن محسوس ہوتا ہو، اُن میں یافت زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ زیادہ معاوضے یا مشاہرے کو بھی ایک طرف ہٹا کر دائرۂ آسائش میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مائیکل سینڈل اور تھامس پکیٹی کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ حاضرین کے لیے بہت دلچسپ تھی کیونکہ اُنہیں بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کو ملا۔

''ٹلٹیڈ اِکوئٹی'' صرف ۱۵۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں اِس کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ بیچ میں ایک مقام پر رُک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ چند برس قبل بروکنگز انسٹیٹیوشن نے کالج کے طلبہ کے لیے سبسڈیز، قرضوں اور ٹیکس کریڈٹس کے بارے میں تحقیق کی تھی۔ مجموعی بجٹ ۱۶۲ ارب ڈالر تھا جس میں سے صرف ایک ارب ۱۰ کروڑ ڈالر پیشہ ورانہ یا تکنیکی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعلیم کے لیے دستیاب وسائل جامعات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص تھے اور مقصود صرف یہ تھا کہ وائٹ کالر جاب کے لیے نئی نسل کو اچھی طرح تیار کیا جائے۔ طلبہ کے ذہنوں میں یہ بات ٹھونس دی گئی تھی کہ ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھ کر کمپیوٹر پر کام کرنا ہی اچھی جاب ہے۔ مزید یہ کہ فیلڈ کام کرنا کوئی اچھا تجربہ نہیں۔

امریکا سمیت بہت سے ترقی یافتہ ممالک اب بھی صرف وائٹ کالر جابز پر متوجہ ہیں۔ وہ نئی نسل کو تکنیکی معاملات میں آگے بڑھانے کے مُوڈ میں دکھائی نہیں دیتے۔ اُن کی کوشش ہے کہ نئی نسل ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سکون سے کام کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہی سبب ہے کہ اب دنیا بھر میں اُن تربیت یافتہ نوجوانوں کی شدید کمی محسوس کی جارہی ہے جو تکنیکی شعبوں میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہوں۔

ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ترقی یافتہ اقوام سمیت بیشتر ممالک تکنیکی تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ فنڈ مختص کیوں نہیں کرتے۔ بیشتر کا یہ حال ہے کہ جامعات کی سطح کی تعلیم ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور نئی نسل کے ذہنوں میں یہ بات ٹھونسی جاتی ہے کہ اگر انہیں ڈھنگ سے جینا ہے تو جامعہ سے کوئی سند لیں اور طالع آزمائی کریں۔ ہنرمندی اور تکنیکی تعلیم کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جارہی۔ سوشل میڈیا پر بھی یہ بات زور دے کر بیان کی جاتی ہے کہ اگر ڈھنگ سے جینا ہے تو ہنرمندی بنیادی چیز نہیں، بنیادی چیز ہے کسی معروف جامعہ سے حاصل کردہ سند۔ دنیا بھر میں اب یہی مائنڈ سیٹ پایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں اِس وقت ٹرینڈ یہ ہے کہ جو بچے ہائی اسکول کے بعد ٹیکنیکل لائن لیتے ہیں، اُن کی حوصلہ شکنی کی جائے، اُنہیں بار بار احساس دلایا جائے کہ جو لوگ کسی جامعہ سے سند لے کر ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھتے ہیں، وہ اعلیٰ درجے کے ہیں اور اُن کی زندگی ہی مثالی ہے۔

کاروباری ادارے، حکومتیں اور مجموعی طور پر معاشرے تکنیکی تعلیم اور ہنرمندی کے معاملے میں رُوکھے پن پر مبنی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کسی خاص ہنر میں اپنے آپ کو آزمانے والوں کو زیادہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ جب تک کام کے مقامات ہیں اور کام ہے تب تک افرادی قوت ملتی رہے گی، منافع کمایا جاتا رہے گا اور افرادی وسائل کا معیار بلند کرنے کے حوالے سے سرمایہ کاری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ کیفیت ایسی ہی ہے جیسے کوئی کار خوب چلائی جارہی ہو اور اُس میں تیل تبدیل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جائے۔ جب تک گاڑی چل رہی ہوتی ہے تب تک اُس کے بیرونی حصے میں کوئی ٹوٹ پھوٹ دکھائی نہیں دے رہی ہوتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اندر ہی اندر شکست و ریخت کا شکار ہو رہی ہوتی ہے۔

معیشتوں کو پہنچنے والا نقصان بہت زیادہ ہے اور نمایاں بھی۔ مینوفیکچرنگ سیکٹر میں یہ نقصان بہت آسانی سے شناخت کیا جاسکتا ہے، حجم کو سمجھا جاسکتا ہے۔ شپ یارڈز اور دیگر غیر معمولی تکنیکی شعبوں میں افرادی قوت کی کمی اب نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی ہے۔ سوال دفاتر کا نہیں، فیلڈز کا ہے۔ دفتر سے باہر فیلڈز میں کام کرنے والوں کی کمی بڑھتی جارہی ہے۔ تکنیکی مہارت کے حامل افراد کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ اُنہیں اچھے، بلکہ قابلِ رشک مشاہرے بھی دیے جارہے ہیں مگر پھر بھی معاشروں کی مجموعی کیفیت ایسی ہے کہ نئی نسل اِس طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتی۔ باقاعدگی سے یعنی پوری دلچسپی کے ساتھ کام کرنے والے نوجوان ہنرمند خال خال ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد کالج یا جامعہ کی سطح پر تعلیم پانے والے دفتر کی جاب چاہتے ہیں، فیلڈ کی نہیں۔ فیلڈ میں کام کرنا اُنہیں توہین جیسا محسوس ہوتا ہے۔ زیادہ محنت اور تکنیکی مہارت والے شعبوں سے نئی نسل دور ہو رہی ہے۔ سبھی کو اپنے اپنے دائرۂ آسائش میں رہتے ہوئے کام کرنا پسند ہے۔ جن شعبوں میں بظاہر کشش نہ ہو، اُن کی طرف نئی نسل مشکل سے متوجہ ہوتی ہے۔ شپ یارڈز اور دیگر محنت طلب مقاماتِ کار سے نئی نسل اِس لیے دور رہتی ہے کہ اُس کے خیال میں اِن شعبوں میں کام کرنے سے شخصیت بگڑ اور اُدھڑ جاتی ہے۔ سبھی چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آرام دہ ماحول کی جاب میسر ہو۔

ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ جب بعض تکنیکی شعبوں میں افرادی قوت کی شدید کمی ہے اور عمومی طور پر بھی تمام ہی تکنیکی شعبے افرادی قوت کی کمی کا شکار ہیں تو پھر حکومتیں اِس طرف زیادہ متوجہ کیوں نہیں ہو رہیں یعنی نئی نسل کو اِن شعبوں کے لیے تیار کیوں نہیں کر رہیں۔

بہت سے نوجوان یہ سوچ کر صنعتی اداروں میں تکنیکی شعبے کی تربیت نہیں کر پاتے کہ آمدن کم رہے گی۔ ایسا نہیں ہے۔ بہت سے نوجوان کام کے دوران حادثے کے خطرے یا خدشے کے پیشِ نظر تکنیکی شعبوں کی طرف نہیں جاتے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ جدید ترین ٹیکنالوجیز اور پروٹوکولز کے نتیجے میں اب صنعتی اداروں میں حادثے برائے نام رہ گئے ہیں۔ انسانی غلطی تو کسی بھی وقت ممکن ہے۔ بیشتر حادثے انسانی غلطی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مشینری بھی ناکام ہوسکتی ہے مگر بالعموم اُسی وقت ناکام ہوتی ہے جب انسان کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔

سب سے پہلے تو چند تلخ حقیقتوں کا اعتراف کرنا ہوگا۔ تکنیکی شعبوں کی اکثریت کا عوام کی نظر میں تاثر اچھا نہیں۔ کام کا ماحول بہت پریشان کن ہوتا ہے اور نئی نسل اِس سے دور بھاگتی ہے۔ سخت محنت والے شعبوں میں کون زیادہ دیر کام کرنا پسند کرتا ہے؟ نئی نسل راتوں رات بہت زیادہ کمانا چاہتی ہے اور وہ بھی اپنے کمفرٹ زون میں رہتے ہوئے۔ سوشل لائف کے لیے بھی وقت چاہیے۔ بیشتر آفس جابز میں یہ سب کچھ بہت حد تک ممکن ہے مگر سوال یہ ہے کہ آفس جابز اب رہی کتنی ہیں۔ کم وقت میں زیادہ کمانا ہو تو انسان کو ایسے شعبوں کا رخ کرنا پڑتا ہے جن میں افرادی قوت کی شدید کمی ہو یعنی نئی نسل جن پر زیادہ متوجہ نہ ہوتی ہو، دلچسپی نہ لیتی ہو۔

نئی نسل کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ فلموں اور ڈراموں سے بہت زیادہ متاثر رہتی ہے۔ سوشل میڈیا پر جو ریلز وہ دیکھتی ہے، اُن سے ایسا بہت کچھ اخذ کرتی رہتی ہے جن کے اخذ کرنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج کے بیشتر نوجوان کیریئر کے حوالے سے ڈھنگ کا فیصلہ آسانی سے نہیں کر پاتے۔ تین چار شعبوں میں اپنے آپ کو آزمانے اور اچھا خاصا وقت اور توانائی ضائع کرنے کے بعد اُن کا ذہن کچھ کام کرتا ہے اور وہ کوئی شعبہ منتخب کر کے اُس کے سہارے گزر بسر کا فیصلہ کرتے ہیں مگر تب تک معاملہ بہت بگڑ چکا ہوتا ہے۔ کاروباری اداروں کو نئی نسل کی تکنیکی تربیت پر اچھا خاصا خرچ کرنا پڑتا ہے اور بہت کچھ جھیلنا بھی پڑتا ہے۔ جس طور کوئی فوج نئے رنگروٹوں کی تربیت کرتی ہے اور پھر افسران بھی تیار کرتی ہے تاکہ اُن سے مستفید ہوا جاسکے، بالکل اُسی طور صنعتی ادارے بھی نوجوانوں کو بہتر کام کے لیے تیار کرتے ہیں۔ پھر اُن سے بونڈز بھی بھروائے جاتے ہیں تاکہ وہ تربیت پانے کے بعد اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔

تعلیمی اداروں سے تکنیکی معاملات میں تھوڑی بہت تربیت پاکر نکلنے والے نوجوانوں کی غالب اکثریت ڈھنگ کا فیصلہ نہیں کر پاتی اور تین چار سال ٹامک ٹوئیاں مارنے میں ضائع کر بیٹھتی ہے۔ اِس حوالے سے غیر معمولی کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے تاکہ نوجوانوں کے ذہن منتشر نہ ہوں، وہ بروقت درست فیصلہ کر کے ڈھنگ سے کام کرنے کے قابل ہوسکیں۔

بیشتر نوجوانوں کے ذہن میں یہ خوش گمانی پروان چڑھتی رہتی ہے کہ مصنوعی ذہانت کے اِس زمانے میں کچھ بھی بہت آسانی سے ممکن ہے۔ مصنوعی ذہانت یعنی اے آئی کو ہر تالے کی چابی سمجھ لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن اداروں میں کام کا پورا ماحول اے آئی کے بل پر قائم ہے، وہاں بھی انسان کی ضرورت اپنی جگہ ہے جو ختم نہیں ہوسکتی۔ جنہیں اسمارٹ کاروباری ادارے کہا جاتا ہے، اُن میں بھی انسانی وسائل کی ضرورت زیادہ کم نہیں ہوئی۔ اے آئی سے کام لینا بھی انسانوں ہی کا کام ہے۔ صنعتی اداروں میں پورا کا پورا پیداواری عمل مشینوں اور اے آئی کے حوالے سے نہیں کیا جاسکتا۔ روبوٹس سے ڈھنگ سے کام لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ خودکاری ایک نمایاں حقیقت ہے مگر انسان پھر انسان ہے۔ اُسے معقول تربیت دے کر نگرانی پر لگایا جائے تو وہ مشینوں، روبوٹس اور اے آئی سے بہت اچھی طرح کام لیتا ہے اور یوں لاگت کے گھٹنے سے منافع کی شرح بلند ہوتی ہے۔

معقول اور معیاری تکنیکی، صنعتی افرادی قوت تیار کرنا صرف کاروباری اداروں کا معاملہ نہیں۔ اس نیک کام میں حکومتوں کو بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ اس معاملے میں بھرپور دلچسپی لینے کی ضرورت ہے۔ نیم دِلی کے ساتھ کیے جانے والے اقدامات ختم کیے جائیں، نئی نسل کو بھرپور کاؤنسلنگ کے ساتھ کام سکھایا جائے تاکہ وہ معقول، باعزت اور اپنی مرضی کا روزگار آسانی سے پاسکیں۔ موزوں ترین تربیت لازم ہے تاکہ کاروباری اداروں کو بھی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ نئی نسل کو اگر صنعتی اداروں کے لیے تیار کرنا ہے تو طویل المدتی منصوبہ سازی کرنا ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ نئی نسل کو ایسے ماحول میں کام کرنے کا موقع دیا جائے جس سے الگ ہونا ان کے لیے ناممکن نہ بھی ہو تو دشوار ضرور ہو۔

دنیا بھر میں حکومتیں صنعتی اداروں کے ذریعے بہت کچھ حاصل کرتی ہیں۔ یہ نجی ادارے قومی معیشت کو چلانے میں بلاواسطہ اور بالواسطہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ لاکھوں افراد کو روزگار کی سہولت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ادارے حکومت کو بہت بڑے پیمانے پر محصول بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ محصول معیشت کو چلانے میں حکومت کا بھرپور ساتھ دیتا ہے۔ صنعتی اداروں کی ملازمتوں کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل اِن کی طرف تیزی سے اور بڑے پیمانے پر متوجہ ہو۔ ملازمت کے جاری رکھے جانے کی گارنٹی بنیادی شرط ہے۔ اگر ملازمت کے جانے کا خوف یا خدشہ نہ ہو تو نئی نسل زیادہ اور تیزی سے سیکھتی ہے۔ مشاہرہ تواتر سے بڑھایا جائے تاکہ دوسرے رخ پر سوچنے کی گنجائش کم رہ جائے۔ فیلڈ ورک کے دوران بھی تعلیم کی ضرورت ہے۔ بیشتر صنعتی ادارے اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز کر بیٹھتے ہیں۔ اگر نئی نسل کو آٹھ گھنٹوں کے لیے اپرنٹس پر رکھا جائے تو اُس میں چار گھنٹے کی تعلیم بھی لازم ہے تاکہ وہ محض عملی کام کے چکر میں پڑ کر بنیادی باتوں کو بھول نہ جائے۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Failure to nurture young skilled workers will collapse manufacturing".
("chosun.com". April 30, 2026)

# مصنوعی ذہانت کی لڑائی

منیش کمار

مصنوعی ذہانت نے قیامت سی ڈھا رکھی ہے۔ دنیا بھر میں مصنوعی ذہانت (اے آئی) کا غلغلہ ہے۔ ہر انسان اِس ''نعمت'' سے استفادہ کرنے کے چکر میں دوسری بہت سی نعمتوں بالخصوص اصلی انسانی ذہانت کو داؤ پر لگانے پر تُلا ہوا ہے۔ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی، دونوں ہی سطحوں پر مسابقت میں شدت بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اب تمام بڑی طاقتیں چاہتی ہیں کہ مصنوعی ذہانت سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اپنے لیے خوب موافق حالات پیدا کریں۔ امریکا اور چین کے درمیان اِس حوالے سے سرد جنگ جاری ہے۔ یہ سرد جنگ کبھی کبھی گرم یعنی اصل جنگ میں بھی بدلتی دکھائی دینے لگتی ہے مگر پھر معاملات سنبھال لیے جاتے ہیں کیونکہ بڑی طاقتوں کے درمیان تصادم انتہائی تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ دو عالمی جنگیں اِس امر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اے آئی نے دنیا کو مکمل طور پر بدلنے کی قسم سی کھائی ہوئی ہے۔ ہر شعبہ کچھ کا کچھ ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں کسی بھی طاقتور ملک کے لیے ممکن ہی نہیں کہ اے آئی کو نظر انداز کرے۔ ایسا کرنے سے اُسی کے مفادات پر کاری ضرب لگے گی۔

اے آئی کی دنیا پھیلتی جا رہی ہے کیونکہ اِس میں سرمایہ کاری کا حجم بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکا کی ٹاپ کی کمپنیاں ایمیزون، گوگل، مائیکروسوفٹ، میٹا (فیس بک) وغیرہ رواں سال صرف اے آئی کی مد میں ۶۵۰/ارب ڈالر خرچ کرنے والی ہیں۔ چین نے مارک زکر برگ کے ادارے میٹا کے ہاتھوں مانس اے آئی کا ٹیک اوور التوا میں ڈال دیا ہے۔ یہ سودا ۲/ارب ڈالر کا تھا۔ چین کا مؤقف ہے کہ ٹیکنالوجیز پر سب کا حق ہے۔ مسابقت کے اصول درست ہونے چاہئیں، سب کو شفاف طریقے سے کام کرنا چاہیے اور کام کرنے دینا چاہیے۔ مکمل شفافیت اب ممکن نہیں۔ امریکا اور یورپ نے تین ساڑھے تین صدیوں کے دوران جو کچھ کیا ہے، کیا اُسے مکمل طور پر شفاف قرار دیا جاسکتا ہے؟ ان دونوں خطّوں نے ایک دنیا کو اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے تمام ناجائز کام کیے ہیں۔ اب چین اور دیگر ممالک اِن کی طاقت کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں تو اِن کی بدحواسی قابلِ دید ہے۔

میٹا کے ہاتھوں مانس اے آئی کا ٹیک اوور چین کے نیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ ریفارم کمیشن نے التوا میں ڈال دیا ہے۔ اِسے امریکا اور چین کے درمیان معاشی اور تکنیکی معاملات میں ایک زمانے سے جاری سرد جنگ کے ایک اہم مرحلے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ امریکا اور چین کے درمیان سرد جنگ اب میزائلوں، طیاروں اور بموں سے ہٹ کر مائیکرو چپس، برآمدات پر کنٹرول اور کارپوریٹ ناکہ بندی کی راہ پر مُڑ گئی ہے۔

اے آئی کی سرد جنگ میں پہلا وار امریکا نے کیا تھا۔ سابق امریکی صدر جو بائیڈن نے اکتوبر ۲۰۲۲ء میں چین کو جدید ترین اے آئی چپس اور سیمی کنڈکٹرز کی برآمد پر پابندی عائد کردی تھی۔ تب سے دونوں ملکوں کے درمیان اے آئی کے معاملے پر سرد جنگ نے زور پکڑنا شروع کیا تھا۔ چین نے جنوری ۲۰۲۵ء میں ڈیپ سیک کے نام سے ایک اے آئی چیٹ بوٹ لانچ کیا تھا۔ امریکا نے الزام لگایا تھا کہ چین نے اس چیٹ بوٹ میں اُس کے اے آئی ماڈلز کی نقل کی ہے۔ حال ہی میں ڈیپ سیک نے پھر دھماکا کیا ہے۔ اُس نے ۲۴/اپریل کو نیا اے آئی ماڈل وی۔۴ لانچ کیا ہے۔ یہ ماڈل خاص طور پر ایسینڈ چپس کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

اے آئی کی جنگ اب تجربہ گاہ کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اب یہ بورڈ رومز، کنٹرول رومز اور کاروباری امور کی دستاویزات میں لڑی جا رہی ہے۔ ہر اقدام جغرافیائی اور سیاسی سطح کا ہے۔ ہر چپ کی فروخت ایک باضابطہ، منظور شدہ فیصلہ ہے۔ کسی بھی ماڈل کی لانچنگ اب ملک کے مجموعی مفاد کے حوالے سے اسٹریٹجک وزن کی حامل ہوتی ہے۔

میٹا ایک بڑی کمپنی ہے۔ فیس بک بھی اِسی کے تحت کام کرتی ہے۔ مارک زکر برگ کو اے آئی کی دنیا میں قدم مضبوط کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اُس نے اپنے اس پہلو کو مستحکم کرنے کے لیے مانس اے آئی کو خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میٹا نے دسمبر ۲۰۲۵ء میں اعلان کیا تھا کہ وہ مانس اے آئی کو خرید لے گا۔ اگر ہوتا تو یہ ۲/ارب ڈالر کا سال کا سب سے بڑا سَودا ہوتا۔ مانس اے آئی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ امریکا اور یورپ میں اُس کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ امریکی ادارے یہ برداشت کرنے کو تیار ہی نہ تھے کہ کوئی اُن کے سامنے کھڑا ہو۔ چین نے اس ادارے کی کارکردگی کو سنگاپور منتقل کیا اور اُس کے کارپوریٹ ڈھانچے میں ضروری تبدیلیاں کیں۔ یہ کافی نہ تھا۔ امریکا چاہتا تھا کہ مانس اے آئی کو چین کے ہاتھ سے چھین لیا جائے۔ اِس کے جواب میں اپنے ہاتھ مضبوط رکھنے کے لیے چین نے ایک نیا اصول وضع کیا کہ اگر کسی کمپنی کے محققین، ڈیٹا اور ذہنی اثاثے اصلاً چینی ہوں تو اُس کے انتظامی امور سے مکمل طور پر دست بردار نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ چین بالعموم طے پاجانے والے سَودوں کو مسترد یا منسوخ کرنے کا عادی نہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اے آئی میں امریکا اب بھی چین سے بہت آگے ہے۔ اُس کے پاس کئی ماڈلز ہیں جو غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ یہ ماڈلز حساب کتاب، دلائل اور دیگر پیچیدہ کام بہت آسانی سے کرتے ہیں۔ اے آئی ماڈلز کی بنیاد پر امریکا نے ایسی بہت سی چیزیں تیار کی ہیں جو اُس کے کاروباری اور تزویراتی مفادات کو تقویت فراہم کرنے میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ اینتھروپک نامی امریکی کمپنی نے بھی ایک اے آئی ماڈل مارکیٹ میں پیش کیا ہے جس نے دنیا بھر کی ٹاپ آئی کمپنیوں اور بینکوں میں کھلبلی مچادی ہے۔ اس بات کے شواہد بھی ملے ہیں کہ چین نے امریکی اے آئی ماڈلز کی کاپی کرکے اپنے اے آئی چیٹ بوٹس کو مضبوط بنایا ہے۔

امریکا اور چین کے بڑے ہائی ٹیک اداروں کے درمیان جاری سرد جنگ ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اب کوئی بھی ملک پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔ دنیا بھر میں بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ امریکا اور چین کے ساتھ ساتھ یورپی یونین، روس، بھارت اور جنوبی افریقا بھی میدان میں ہیں۔ جاپان اگرچہ بہت مضبوط ملک ہے مگر وہ عالمی سطح کی مہم جُوئی پر زیادہ یقین نہیں رکھتا اور اپنی حدود میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ چین، روس، بھارت اور دیگر ابھرتی ہوئی معیشتوں کے لیے اب غیر متعلق اور مسابقت سے دُور رہنا ممکن نہیں۔ اے آئی میں بھارت اور روس ابھی بہت پیچھے ہیں مگر چین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اب مکمل طور پر میدان میں ہے۔ اب اُس کے لیے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں۔ درحقیقت اب صرف چین ہے جو امریکا کو ٹکر دینے کی سکت بھی رکھتا ہے اور عزم بھی۔ امریکا بھی جانتا ہے کہ اگر وہ ڈھیلا پڑا تو معاملات بہت بگڑیں گے۔ ایسے میں لے دے کر یہی ایک راستہ بچا ہے کہ میدان میں رہا جائے، جدوجہد جاری رکھی جائے۔ (ترجمہ: ابوصباحت)

(بحوالہ: ''گجرات سماچار'' احمد آباد، بھارت۔ ۲۸/اپریل ۲۰۲۶ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950